مکتوباتِ ماسکو

چند یادیں، چند تاثرات

روح افزا حیدر



مکتوباتِ ماسکو

چند یادیں، چند تأثّرات

روح افزا حیدر

مکتوباتِ ماسکو

چند یادیں، چند تاثرات

مرتّبہ :-

عبدالرؤف ملک

پیپلز پبلشنگ ہاؤس

۴۔ بیسم روڈ ⊙ لاہور

۱۹۸۰ء

ناشر :- عبدالرؤف ملک
پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور

مطبع :- مطبع اسلامیہ السعودیہ
رنگ چونگی - لاہور

[redacted]

مندرجات

○

عرضِ مرتّب

زیرِ نظر کتاب "مکتوباتِ ماسکو" محترمہ روح افزا حیدر کے اُن مکتوبات کا انتخاب ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے قیامِ ماسکو کے دوران تحریر فرمائے اور پاکستان میں شائع ہونے والے مختلف اردو جرائد کے صفحات کی زینت بنتے رہے۔

رُوح افزا حیدر صاحبہ جناب سجاد حیدر صاحب کی اہلیہ ہیں جو کئی برس سوویت یونین میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ماسکو میں تعینات رہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ ماسکو میں قیام کے دوران انہوں نے سوویت یونین کی مختلف جمہوریتوں اور دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور وہاں کے اہم اور تاریخی مقامات دیکھے، وہاں منعقد ہونے والی مختلف تقریبات میں شرکت کی۔ خاص و عام لوگوں سے ملیں، اُن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ مختلف موضوعات پر بات چیت کی اور اس تمام سیر و سیاحت اور مشاہدات سے جو تاثرات ان کے ذہن پر ثبت ہوئے، انہیں اِن مکتوبات میں نہایت شگفتہ پیرائے میں پیش کر دیا ہے۔

اِن مکتوبات کے لکھنے والی کوئی سیاست دان نہیں اور نہ ہی کوئی خاص نظریہ یا عقیدہ رکھتی ہیں۔ وہ محض ایک محبِّ وطن پاکستانی خاتون ہیں اور ان کا یہ جذبہ حب الوطنی اُن کی تحریر کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے

یہ مکتوبات کسی قسم کے پروپیگنڈا کی ذیل میں نہیں آتے کیونکہ اُنھوں نے آنکھوں پر کسی قسم کے تعصب کی پٹی نہیں باندھی اور نہ ہی گردوپیش کے حالات و واقعات کو کسی مخصوص رنگ کی عینک سے دیکھا ہے۔ بلکہ ایک متجسّس انسان اور سچّے محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے جو کچھ مشاہدہ کیا اُسے بلاکم و کاست نہایت دلنشیں اور فنکارانہ انداز میں پیش کر دیا ہے۔

اس مرتّب کو امید ہے کہ محترمہ رُوح افزا حیدر کے مکتوباتِ ماسکو سے قارئین اگر ایک طرف اُن کے منفرد طرزِ نگارش سے محظوظ ہوں گے تو دُوسری طرف اُن کو سوویت یونین اور وہاں کی وسط ایشیائی جمہوریتوں کے بارے میں اُن حقائق کو صحیح تناظر میں سمجھنے کا موقع ملے گا، جنہیں آج تک مفاد پرست عناصر اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے پاکستان کے عوام کے سامنے گمراہ کن انداز میں پیش کرتے آئے ہیں۔

عبدالرؤف ملک

لاہور

۲۱ر اپریل ۱۹۸۰ء

مکتوبِ ماسکو

۱

لال چوک

"شعلہ سا لپک جائے ہے گُفتار تو دیکھو"

اس مصرع کی ترکیب نہ معلوم مجھے ٹھیک سے یاد ہے یا نہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہم صحرا نوردوں کے لیے اپنی پیاری بھاشا کو یاد رکھنا آسان نہیں۔ یہ مصرع یوں یاد آیا کہ آج سرخ جھنڈوں سے ماسکو کی فضا لالہ فام ہے۔ آج مزدور اور کسان انقلاب کی سالگرہ کا دن ہے۔ آیئے تو ہم بھی "سیر کریں کوہ طور کی" ۱۹۱۷ء سے ۱۹۷۶ء تک ماسکوا دریا کا پانی کتنا بہہ چکا ہے مگر دریا کے ساتھ ساتھ کریملین کے محلات اُسی قدیم شان و شوکت سے پریوں کی طرح پر باندھے کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ کیا رعنائی ہے کیا شوکت ہے ان محلات میں۔ ان کے آس پاس گرجا گھروں کی فصیلوں، میناروں، برجیوں اور گھنٹہ گھروں میں انسان ان کے حسن اور دلکشی کے سحر سے مسحور ہو کر ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔

اس تقریب کے لیے ماسکو کو دلہن کی طرح سجانے کا عمل کئی دن سے شروع تھا۔ سرکاری عمارات، رنگ و روغن سے مزیّن سڑکیں اور روشیں صاف ستھری، لیمپوں کی روشنیاں دوچند بلکہ سہ چند...... اس ہفتہ سرخ پھولوں کے گلدستے سڑک کے لیمپوں کے ساتھ لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہماری سڑک سَدُووا کُدرِنکایا کے قریب لینن کی بڑی بڑی تصویریں دکانوں اور عمارتوں پر نصب ہیں۔ ان کے قریب سے موٹریں گزرتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ لینن کا پُر وقار اور مطمئن چہرہ اپنے ہموطنوں کو مبارک باد

دے رہا ہے۔

اگر آپ تمام روسیوں کو ایک مرکز پر دیکھنا چاہتے ہیں تو چلیے لال چوک (RED SQUARE) چلیں۔ یہاں آپ کو سویت یونین کی تمام علاقائی زبانیں سننے میں آئیں گی، جارجیا، آذربائیجان، ترکمانیہ، قزاقستان، کرگیز، بیلے روسیا، لیننن گراڈ، سائبریا غرض ملک کے کونے کونے سے روسی سیاح لال چوک کی زیارت کو آتے ہیں۔ یہ سب یہاں ماضی کا تصور باندھتے ہیں۔ حال کا ایک پر سکون انداز سے جائزہ لیتے ہیں اور درخشاں مستقبل کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ کھلا میدان یا چوک کہئے ہمارے دہلی کے چاندنی چوک کی طرح تاریخ میں مشہور ہے ع

سوادِ رومتہ الکبریٰ سے دِلّی یاد آتی ہے وہی شوکت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی

لال چوک کے عقب میں کریملن کے محلات ہیں۔ یہاں قدیم زار اور زاریہ روس پر حکومت کرتے تھے۔ آج کل یہاں سویت یونین کے دفاتر ہیں اور معزز غیر ملکی مہمانوں اور سفیروں سے ملنے کے لیے سجے سجائے ہال میں سرکاری دعوتیں بھی اسی قدیم روش میں انھی ہال میں دی جاتی ہیں۔

لال چوک سے دائیں طرف نو گنبدوں والا (ST BASAL BLESST) کا قدیم گرجا ہے۔ اس کے سبز اور سرخ سونے سے منڈھے ہوئے کلس ہیں۔ یہاں کے کلیسا اس قدر خوبصورت اور پُروقار ہیں اور وضع قطع میں قریب قریب مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو سیاح اپنی کتابوں میں پیاز نما گرجا گھر کہتے ہیں۔ مساجد اور ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ گنبد کے اوپر سونے کی صلیب واضح نظر آتی ہے۔ یعقوب بھائی جب جب اکتوبر میں یہاں آئے تو ان کلیساؤں کو دیکھ کر انھیں بھی احساس ہوا کہ ساخت میں یہ مسجد کے بہت قریب ہیں۔ میں نے پہلی بار یہ گریک آرتھوڈیکسی کلیسا ۱۹۶۳ء میں یروشلم میں دیکھا۔ یہ وہ سنہرا زمانہ تھا جب بیت المقدس پر اغیار کا قبضہ نہیں تھا۔ کریملن کے ہی درمیان میں ایک بڑا سا کلیسا CHURCH OF ASSUMPTION ہے یہاں سب زار بادشاہوں کی رسم تاجپوشی ہوا کرتی تھی سب سے پہلے IVON THE TERRIBLE اور اس کی ملکہ کی تاجپوشی ہوئی۔ وہ روس کا پہلا بادشاہ ہے جس نے گرینڈ ڈیوک GRAND DUKE سے بدل کر اپنا نام زارِ روس اختیار کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا

گرجا ہے۔ یہ قوسِ قزح کے رنگوں سے مزین ہے۔ بالکل کھلونا سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اپنی قدیم تاریخ کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور سیاحوں کے لیے اپنی آب و تاب کی وجہ سے بہت زیادہ پر کشش ہے۔ کرملین پیلس کے سینٹ جارج میں بڑی بڑی دعوتیں دی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسی عمارت ہے جسے بقول اقبالؔ کے بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ۳۱ اکتوبر کو وہاں شمالی ویٹ نام کے وفد کے اعزاز میں دعوت تھی۔ چھ بجے کا بلاوا تھا۔ اس روز برف پڑ کر تھم چکی تھی۔ سردی پھر بھی غضب کی تھی، نچلی منزل کی ڈیوڑھی میں کوٹ مفلر اور دستانے اتار کر غلام گردش سے گزر کر وسطِ ہال کی سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں، سنگِ مرمر کی فراخ سیڑھیاں جن پر نرم نرم سرخ مخمل، زینہ کے درمیاں بلوریں جھاڑ جس کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ زینہ کے بائیں طرف ایک بہت بڑی آئل پینٹنگ تھی۔ غالباً پیٹر اعظم یا کسی زار کی۔ زینہ چڑھتے ہی سامنے کی دیوار پر لینن کی قد آدم ایک مشہور تصویر پر نظر پڑی جس میں وہ کرملین پیلس میں خطاب کر رہا ہے۔ غلام گردش سے گھوم کر بائیں ہاتھ پر سینٹ جارج ہال ہے، اس میں قدم رکھتے ہی یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے روس کی تاریخ کا ایک پچھلا ورق الٹ دیا ہے۔ اس ہال کی شان و شوکت اور زیب و زینت میں زار روس کے زمانے سے سر مو فرق نہیں آیا۔ وہی زر لفت کے پردے ہیں وہی بلوریں جھاڑ ہیں جن میں بجائے بڑی بڑی شمعیں روشن ہونے کے بجلی کے بلب ہیں۔ اونچے اونچے بھاری بھر کم دروازے ہیں۔ اور یہ سب سونے کے بنے ہوئے ہیں یا سونے سے مڑھے ہوئے ہیں۔ یہ دروازے ہمارے مغل بادشاہوں کے محلات اور روٗسا کی حویلیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ بجلی کی روشنی میں سونے کی طرح جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں۔ فرش لکڑی کا ہے جس پر بہت نفیس بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ دیواریں چکنی اور ہاتھی دانت کی طرح سفید، ستون سب سنگِ مرمر کے اور ان پر پتھر کے بیل بوٹے۔ سینٹ جارج کا تاریخی گھوڑے کا نشان بھی دیواروں پر منقش ہے اس کے علاوہ اونچی سفید دیواروں پر سونے کے پانی سے بہت سے نام مع سن کے لکھے ہوئے ہیں۔ میں تو اس ہال کی زیبائش سے ایسی مسحور ہوئی کہ کھانے کی میز پر موجود مہمانوں

کو بھول کر ان قدیم نوادرات کو دیکھنے میں کھو گئی۔ مجھے ان دیواروں پر لکھے ہوئے نام سمجھنے کی کوشش ناتمام میں کھڑا دیکھ کر کینیڈا کے سفیر رابرٹ فورڈ صاحب نے ہنستے ہوئے بتایا کہ یہ ہال تاریخی ہے اور یہ کندہ نام ان سب فوجی افسروں کے ہیں جنھوں نے زار روس کی فوج میں کام کیا اور جو کالم بائیں طرف نظر آرہا ہے یہ وہ فوجی ہیں جو زار روس کے لیے ترکوں سے جنگ لڑے۔ پھر وہ کہنے لگے کہ موجودہ حکومتِ روس کی یہ بہت تعریف کی بات ہے کہ انہوں نے ان تمام یادگاروں کو اسی طرح قائم رکھا۔ اگرچہ ان کی نگرانی پر کروڑوں روبل ہر سال خرچ ہوتے ہیں۔ یہ واقعی حکومت کی دانشمندی اور حکمت عملی ہے۔ یہ آثار قدیمہ لاکھ شاہانہ ہوں اور موجودہ طرز حکومت سے مختلف لیکن ہیں تو روس کی تاریخ کا ایک باب۔ کسی بت کو توڑ دینے سے یا کسی نقش کو بگاڑ دینے سے تاریخ کا وہ صفحہ پھاڑ نہیں سکتے۔ اس عجوبہ روزگار ہال کو دیکھنے کے بعد اسی شام ویت نام کے لیڈر سے ملاقات ہوئی۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور سوچا کیسے جیالے لوگ ہیں جنھوں نے یہ کر دکھایا کہ ؏

جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

چلئے لال چوک تک دوبارہ چلیں۔ صبح کے ساڑھے نو بجے ہیں۔ روسی عوام جوق در جوق لال چوک کی طرف خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں۔ کئی ایک کے ہاتھوں میں درخت کی سبز ٹہنیاں ہیں اور چند کے ہاتھوں میں پھول ہیں۔ اکثر کاغذی پھول لہرا رہے ہیں چونکہ موسم گل حقیقت میں ابھی شروع نہیں ہوا۔ بڑے بڑے سرخ جھنڈے یکم مئی کی تاریخ کو اجاگر کرتے ہوئے ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ ہم لینن کے مقبرہ کی بائیں طرف چبوترے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہیں۔ لینن کے مقبرہ کے اوپر کریملن ٹاور پر دس بجتے ہی بریژنیف صاحب تشریف لائیں گے اور وہاں سے عوام کے جلوس کی سلامی لیں گے۔ کریملن کے بالکل قریب لینن کے مقبرہ کے ساتھ اسپاسکی (SPASKY) نام کا ایک ٹاور ہے جو وہ گھنٹہ گھر ہے جسے (IVON THE TERRIBLE) نے بنوایا تھا۔ اس کے گھنٹوں کی آواز پر کریملن کا اوقات عمل متعین ہوتا تھا۔ محل کے

سامنے ایک بہت بڑا دھات کا گھنٹہ (BELL FRAY) ہے جسے (ISER BELL) کہتے ہیں۔ اسے ۱۷۳۷ء میں بنایا گیا تھا یہ دنیا کا سب سے بڑا گھنٹہ ہے۔ اس کا وزن دو سو ٹن ہے۔ گیارہ ٹن ایک ٹکڑا بناتے وقت الگ ہو گیا تھا۔ جو آج بھی اس کے سامنے پڑا ہے۔ اس پر زار الیکسی اور زارینہ آنیا کی تصویریں کندہ ہیں۔ اس کے اوپر چاندی کی نقش کاری کی گئی ہے۔ جیسا کہ حیدرآباد دکن میں بیدر کے مقام پر کی جاتی تھی۔ نپولین کی فوج نے ۱۸۱۷ء میں ماسکو سے واپس جاتے ہوئے اس گھنٹہ کو بارود سے اڑانا چاہا مگر زیادہ نقصان نہ ہوا۔

لال چوک کا فرش سلیٹی جو کھونٹی اینٹوں سے بنا ہوا ہے یعنی (CREY CABBLE STONE) سے۔ یہ میدان کئی سو سال پرانا ہے۔ صدیاں گزر گئیں اور اس پر وقت کے نشانات کبھی گولیوں سے اور کبھی پھولوں سے مٹتے اور بنتے رہے۔ رات کے اندھیرے میں سپاہیوں کے بھاری قدم اس پر مشعلیں لے کر دوڑتے اور صبح کی روشنی میں بچوں کے پھولوں جیسے قدم گلدستے ہاتھوں میں لیے رواں دواں رہے۔ لال چوک نے شہرۂ آفاق موسیقاروں کی موسیقی بھی سنی اور اپنے نامور لیڈروں کے ملک سے مقدس عہد و پیمان بھی۔ کریملن کے برج و مینار اس محل کے اردگرد سنتریوں کی طرح کھڑے ہیں جیسے ہمالیہ کے لیے ہمارے شاعر نے کہا تھا "اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستان" فصیل کی سرخ پتھر کی دیواریں ان برجیوں کے ساتھ ان قدیم شجاع نائٹس (KNIGNTS) کی زرہ بکتر کی طرح مضبوط اور ناقابل تسخیر معلوم ہوتی ہیں جو مادر وطن کے دل یعنی کریملن کے محلات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو لال چوک کے تاریخی میوزیم کے مقابل کے چبوترے کی اینٹیں اس روز خلاف معمول گرمی سے سلیٹی تھیں پھر بارش سے سیاہ ہو گئیں۔ اور اس روز انقلابی فوج کے سپاہی تاریخی میوزیم کے سامنے سنتریوں کی طرح صف آرا ہوئے۔ زار کے سپاہیوں نے مقابلہ کیا اور لال چوک کے سامنے یہ ہنگامہ بہت دیر تک ہوتا رہا۔ انقلابی بہت کوشش کے بعد ماسکو تک پہنچ گئے۔ اور یہ سلیٹی اور پھر سیاہ اینٹیں سرخ رنگ میں رنگ گئیں۔ سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ اسی چوک سے شروع ہوئی۔ ماسکو کا دل لال چوک ہے۔ اور لال چوک کے عین درمیان میں اس کے محبوب

لیڈر لینن کا مقبرہ ہے۔ اکتوبر کے انقلاب کا لیڈر، کمیونسٹ پارٹی اور موجودہ سویٹ اسٹیٹ کا معمار اس عمارت کے اندر سویا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں ہزاروں روسی اور بیرونی عقیدت مندوں کی قطار صبح سے شام تک ہر وقت طویل نظر آتی ہے۔ اسی لال چوک میں عوام نے بارہا لینن کو اس کی زندگی میں ہشاش بشاش سرگرمی اور شگفتگی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔

روسی خوشی کی ہر تقریب لال چوک میں مناتے ہیں۔ ۷ نومبر کو یہاں فوجی پریڈ ہوتی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں اسی دن یعنی ۷ نومبر کو تاریخی پریڈ سے سرخ فوج مارچ کرتی ہوئی ماسکو کے دروازوں سے ہٹلر کی فوج سے مقابلہ کے لیے گئی۔ ہٹلر کی فوج ماسکو کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ ساڑھے تین سال کے بعد اس چوک میں اسی دن فتح کی پریڈ میں سرخ فوجیوں نے جرمن کے شکست خوردہ فوج کے دو سو جھنڈے (جن میں ہٹلر کا ذاتی جھنڈا بھی شامل تھا) لاکر لینن کے قدموں میں پھینک دیئے۔ ہر سال یکم مئی اور ۷ نومبر کو لال چوک میں پریڈ ہوتی ہے۔

ان یادگار دنوں کے علاوہ بھی لال چوک میں ہر دم زندگی کی گہما گہمی اور رونق سے بھرپور مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ کریملن کے ساتھ ساتھ ماسکوا دریا کے کنارے کنارے روشوں اور پارکوں میں زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ سویت روس کا سرخ جھنڈا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کریملن کی بلندیوں پر لہراتا رہتا ہے اور اونچے میناروں پر لگے ہوئے یاقوت جیسے سرخ ستارے ہر وقت دمکتے چمکتے رہتے ہیں۔ لینن کے مقبرہ کے باہر سدا بہار پھول ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ اس سب جیتی جاگتی مدھ بھرے سندر پس منظر کے ساتھ ساتھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ قدیم اور عظیم لال چوک ہر دم تازہ اور جواں سال ہے ؏

تو اسے پیمانۂ امروز فردا سے نہ ناپ　　　جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ فضا بھیگی بھیگی تھی۔ لیکن آج صبح ۹ بجے مطلع صاف تھا۔ سردی اور بارش کے خوف سے اکثر سفیروں نے فر کی ٹوپیاں اور کوٹ پہن رکھے

تھے۔ ہوا میں خنکی تھی مگر ناگوار نہیں تھی۔ لال چوک میں مرد و زن کا ایک سمندر نظر آتا تھا۔ یہ سمندر تو تھا لیکن طوفان زدہ نہ تھا۔ اطمینان سے، قاعدے قرینے سے، بینڈ اپنے روایتی قومی ترانے بجا رہا تھا۔ دس بجتے ہی بریژنیف مع کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی یعنی پالٹ بیورو (POLIT BUREAU) کے ممبران لینن کے مزار کی سیڑھیاں چڑھتے نظر آئے اور تالیوں سے پورا چوک (میدان) گونج اٹھا۔ دس بجے سے بارہ بجے تک ایک کے بعد ایک عوامی دستہ جلوس کی شکل میں گزرتا رہا۔ اس میں جوان بھی تھے، بوڑھے بھی، بچے بھی اور بچیاں بھی۔ آج فوج کا عمل نہیں تھا۔ ماسکو کے تمام شہری، کارخانہ دار، سکول کالج اور یونیورسٹی کے طلباء اپنی اپنی یونیفارم پہنے اور اپنی اپنی دھنیں بجاتے ہوئے اور پریڈ کرتے ہوئے وہاں سے گزرتے رہے۔ سبزپوش لڑکیوں کا ایک دستہ سرخ رومال لے کر رقص کرتا ہوا بہت بھلا معلوم ہوا۔ بازی گروں نے بھی کرتب دکھائے۔ گیارہ بجے کے قریب ہم نے دیکھا کہ نیلے لباس میں ملبوس چند چھوٹے لڑکوں اور گلابی لباس میں ملبوس چند ننھی منھی لڑکیاں ہاتھوں میں رنگ برنگ پھولوں کے گلدستے لیے سیڑھیاں چڑھے اور جناب بریژنیف کو پھولوں کے گلدستے پیش کیے۔ بریژنیف نے یہ گلدستے ہنستے ہوئے لیے اور بچوں کو پیار کیا۔ یہ دلچسپ عوامی پریڈ بارہ بجے تک رہی۔ بریژنیف کافی چاق و چوبند نظر آ رہے تھے اور دلچسپی سے ہر چیز کو دیکھ رہے تھے۔

واپس اپنے گھر آتے ہوئے اپنی سڑک پر سرخ سبز نیلی پیلی اونی کوٹ اور ٹوپیاں پہنے ہوئے ایک ہجوم گل و لالہ کی طرح ہنستے کھیلتے بچے نظر آئے۔ ہاتھوں میں رنگ برنگے غبارے تھامے ہوئے اور آئس کریم کھاتے ہوئے، اُدھر اونی ٹوپیوں کے نیلے نیلے، اودے اودے، پیلے پیلے پھندنے ہوا میں اڑتے ہوئے پیارے لگ رہے تھے۔ ادھر مجھے اپنے دریچہ کے اوپر فضاؤں میں اڑتا ہوا چاند ستارے والا سبز پرچم بھی پیارا معلوم ہوا اور دل نے چپکے سے کہا کہ:

"اے مری آنکھوں کے تارے ہمیشہ سر بلند رہیو"

مکتوب ماسکو

۲

نئے سال کا تہوار

محترم و مکرم - تسلیم

آپ کا ۲۳ر دسمبر کا لکھا ہوا شفقت نامہ ملا - آپ کی اور بیگم صاحبہ کی خیریت معلوم ہو کر بے حد مسرت ہوئی - آپ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ایک مدت بعد دیکھ کر ایک استعجاب آمیز فخر محسوس ہوا جس میں دلی مسرت کے احساسات بھی ملے جلے ہیں -

روس میں کرسمس کا تہوار سرکاری طور پر نہیں منایا جاتا - مگر کرسمس سے ہفتوں پہلے ماسکو کے بازاروں میں گھر کی سجاوٹ کی چیزیں اور کرسمس کے درخت ڈھیروں خریدے جاتے ہیں - منور اور میں جب عید کے لیے شروع دسمبر میں سفارت کے بچوں کے لیے کھلونے اور عید کے لنچ کی سجاوٹ کے لیے قمقمے اور غبارے وغیرہ لینے گئے تو تحفوں اور کھلونوں کی ایک بڑی دوکان میں خریدار بچوں اور بڑوں کا ایک ہجوم تھا، وہاں ہر قیمت کے کھلونے تھے - اور ان کی قیمت مغربی یورپ سے کم تھی - قندیلیں فانوس شمعیں رنگ برنگ کی چمکتے ہوئے ستارے ربن - گوٹا اور کرن وغیرہ - کرسمس کے درخت چھوٹے اور بڑے - مصنوعی تو دکان پر مل جاتے ہیں مگر اصلی (X MASTREE) کے لیے تو پہلے سے آرڈر دیا جاتا ہے اور باہر جنگل سے لایا جاتا ہے (یہ فر کے درخت ہیں) اور ماسکو کے قریب نئے سال کے درخت

خاص طور پر اگائے جاتے ہیں۔

اس کرسمس کو گھما گھمی میں ایک دن پہلے اپنی روسی زبان کی استاد نادیا سے پوچھا کہ آپ لوگ تو کرسمس نہیں مناتے۔ ۲۵ دسمبر کو چھٹی بھی نہیں ہوتی۔ پھر ع

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

وہ ہنس کر کہنے لگیں "میڈم ہم کرسمس تو بے شک نہیں مناتے مگر نیا سال تو بہت جوش و خروش مناتے ہیں۔ اور یہ سب تیاریاں اور خوشیاں نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہیں۔ اور کرسمس ٹری کو ہم نئے سال کے درخت کہتے ہیں۔ اور یوں بھی ہماری نانیاں دادیاں (نادیا پیاری سی لڑکی ہے) پرانے رسم و رواج کی پابند ہیں۔ ان کے ہونے سے کرسمس ٹری ایک جذباتی چیز ہے۔ اور بچوں کو بھی کھلونوں اور قمقموں سے سجا سجایا، چمکتا دمکتا۔ سر سبز فر کا درخت برف سے ڈھکا ہوا۔ بہت بھلا لگتا ہے۔ جب میں اپنا نئے سال کا درخت گھر لائی اور اس میں بتیاں لگائیں تو میری بیٹی تانیا (جو تین سال کی ہے) خوشی سے تالیاں بجا بجا کر درخت کے اردگرد دیر تک ناچتی رہی۔ اور مجھ سے کہنے لگی۔ امی آپ تو میری بہت اچھی امی ہیں۔ نادیا نے بتایا کہ نئے سال کا تہوار ہمارا بہت مقدس تہوار ہے۔ اس میں سب قریب کے عزیز اور عزیز ترین دوست جمع ہوتے ہیں۔ اور نانیاں دادیاں دادا ابا۔ نانا ابا ضرور آتے ہیں۔ اور ہم سب ایک دوسرے کو تحفے دیتے ہیں۔

(نہ معلوم ہمارے ہاں عید بقر عید پر تحفے دینے کا رواج عام کیوں نہیں ہے؟ رسول اکرم صلعم کی ایک حدیث ہے کہ دوسروں کو تحفے دینے سے محبت بڑھتی ہے۔ عرب ممالک میں عید بقر عید پر تحفے اکثر دیئے جاتے ہیں، مگر ہمارے بچپن میں تو بچوں کو روپے ہی ملتے تھے۔ جو اکثر مائیں لے لیتی تھیں۔ یا اکثر شفیق باپ جب نماز پڑھ کر آتے تو کھلونے بھی خرید کر لاتے۔ مراۃ العروس میں اکبری خانم کی فرمائش تو آپ کو غالباً یاد ہو گی۔ جو عید پر انہوں نے محمد عاقل سے کی ڈھیر سارے بیروں اور سنگھاڑوں اور نہ معلوم کس کس چیز کی.....)

" اور بجائے کرسمس فادر کے ہمارے ہاں (GRAND FATHER FROST) آتا ہے۔ اور وہ بچوں کے کھلونے لاتا ہے۔"

FROST کو پنجابی میں کورا کہتے ہیں یا کہر سخت سردی کے زمانے میں یہ برف نما ورق کی طرح سڑکوں تالابوں اور گھاس پر نظر آتا ہے۔ دسمبر۔ جنوری کی صبح کو کالج جاتے ہوئے ہمارے گھر کے سامنے چھوٹی سی نہر (FROST) سے جمی رہتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں ہمارا بوڑھا مالی مجید جو بس تک ساتھ جاتا کہتا تھا کہ " بی بی جی آج تو کھال (نہر) کہرے (FROST) سے جم گئی ہے بالکل"........ اس نئے سال کے دادا آبا کے ساتھ ایک پیاری سی لڑکی ہوتی ہے جسے برف کی دوشیزہ کہتے ہیں۔ روسی زبان کی بچوں کے لیے پریوں کی کہانیوں کی کتاب میں یہ برف کی نازک سی دوشیزہ موسم بہار کی بیٹی ہے۔ یہاں برف کی دوشیزہ کا ایک بہت خوبصورت (BALLAD) ہے۔ محترمہ بیگم بھٹو صاحبہ کے ساتھ ہم نے بھی دیکھا تھا۔ اس کی موسیقی غالباً ٹالسٹائی کی لکھی ہوئی ہے۔ نادیا کہنے لگی۔ " اس دفعہ تو فروسٹ دادا آبا کا پارٹ میرے سسر ادا کریں گے۔ وہ بہت لمبے چوڑے ہیں اور فر کی جھالر لگے سرخ مخمل کے چغہ میں بے حد معزز وشکیل معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کے سر پر ہم ایک سرخ اونی "تربند" پگڑی یا دستار (یہ غالباً ازبکستان اور تاجکستان کا اثر ہے) باندھیں گے۔ ان کے کندھے پر ایک بوری نما تھیلا ہوگا۔ جس میں سب کے لیے چھوٹے چھوٹے تحفے ہوں گے۔ نئے سال کا استقبال ہم بارہ بجے سے پہلے ہی گانے بجانے اور رقص سے کرتے ہیں۔ اور ٹھیک بارہ بجے ہم ایک دوسرے کو ہنستے ہوئے نئے سال کی مبارکباد ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہوئے دیتے ہیں۔ اور پھر ایک اور رقص اور موسیقی کا دَور اسی طرح گاتے بجاتے۔ کیک اور مٹھائی کھاتے ہوئے ہنسنے ہنسانے میں پوری رات گزار دیتے ہیں۔"

۳۱ر دسمبر۔ آج نئے سال کی دعوت نیوزی لینڈ کے سفیر کے ہاں ہے۔ این۔ او برائین ہندوستان میں ہمارے ساتھ تھے۔ اس لیے پرانے عزیز دوست ہیں۔ نیچے

بڑوں کی پارٹیوں میں جانے سے گھبراتے تھے ۔ بہرحال سجاد اور رانی کے ہاتھ اس کے لیے نئے سال کا تحفہ روسی بلور کے دو بنفشی رنگ کے گلاس بھجوا دیئے ۔ نئے سال کا ٹی ۔ وی پر بہت عمدہ پروگرام رہا ۔ سجاد اور میں دیکھتے رہے ۔ باہر کریملین محل، اور لال چوک، لال قلعہ کہہ لیجیے تمام بقعۂ نور بنا ہوا ہے ۔ ماسکو کے بڑے پُر رونق بازاروں اور پارکوں میں نئے سال کے اونچے اونچے سرسبز درخت روشن شموں سے جگمگا رہے ہیں اور ان پر برف کی جھالر دلھنوں کی پیشانی اور زلفوں پر افشاں کی طرح دمک رہی ہے ۔ ماسکو کو اکثر روکھا پھیکا شہر کہا جاتا ہے ۔ مگر مجھے تو گرمیوں میں بھی یہ بھلا لگا ۔ اور سردیوں میں تو ماسکو کے حسن کا کیا کہنا ۔ بقول ڈاکٹر ہمایوں خاں ماسکو کو دیکھنا ہے تو جاڑوں میں دیکھئے ۔ واقعی اونچے اونچے قد کے درخت ہیں ۔ سربلند اور پُر وقار برف کی چلمن سے ڈھکے ڈھکے ۔

ع : صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

بچوں کے لیے کھیل کے میدان بہت وسیع ہیں ۔ وسط شہر میں "گورکی پارک" ہے ۔ لینن ہل کے قریب میدان اور پہاڑیاں ہیں جہاں بچے سمور کے کوٹ اور ٹوپیاں پہنے سکیٹنگ برف پر ہاکی اور (SKING) کرتے نظر آتے ہیں ۔ اور نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی برف کے کھیلوں میں شوق سے حصہ لیتے ہیں ۔ اور صحت کے لیے ورزش بھی ضروری ہے ۔

ننھے بچوں کو بھی مائیں سیر کراتی ہیں بچہ گاڑیوں میں سنجاف و سمور میں لپٹی ہوئی گرم مفلر اور اونی دستانے پہنے سڑک پر تیز تیز چلتی نظر آتی ہیں ۔ اور تعجب ہے کہ اس قدر برف پر پھسلتی بھی نہیں ۔ ایک ہم ہیں کہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں ۔

اس عظیم ملک میں رہتے ہوئے، اپنا پیارا ملک بہت یاد آتا ہے ۔ اور جی چاہتا ہے ۔ دنیا کی تمام اچھائیاں اور رعنائیاں سمٹ کر ہمارے ملک میں آجائیں اور ہم ایمان اتحاد اور عمل پیہم کی قوت سے اس کے چاند تارے والے جھنڈے کو تاابد سرفراز رکھیں اور یہی نئے سال کی دعا ہے ۔

مکتوب ماسکو
۳

بہار کا انتظار

۱۲ار فروری۔ آج کھڑکی سے باہر برف سے لدے پھندے بلورین درختوں اور برف کی سل کی طرح چمکتی ہوئی پھسلتی ہوئی سڑکوں کو دیکھ کر نہ معلوم مجھے کیوں بچپن میں سنا ہوا ایک موہوم سا شعر یاد آرہا ہے۔ جس کا پہلا مصرع ہے ؏

سچ بتا بابا کب آئے گی بہار

مدّت کی بات ہے۔ بیتے دنوں کی کہ گرمیوں کی طویل دوپہر میں والدہ کہتیں کہ بند کمرے میں بجلی کے پنکھے کے نیچے آرام کرو اور میں سکول کا کام ختم کر کے اوپر کی منزل میں پہنچ جاتی۔ جہاں درمیان کی چھت پر ایک کمرہ پرانے رسالوں سے بھرا ہوا تھا عصمت کی پرانی جلدیں ترتیب سے الماری میں رکھی ہوئی۔ شریف بی بی کے متعدد پرچے اور مخزن کی جلدیں۔ گرمیوں کی یہ لمبی اور پُرسکون دوپہر اور پرچوں کی ورق گردانی میں ایسی دلچسپی سے گزرتی کہ کھڑکی سے آتی چلچلاتی دھوپ کا احساس بھی نہ ہوتا۔ اور شام ہوجاتی اس زمانے میں کومک وغیرہ نہ تھے۔ ہمارا اوڑھنا بچھونا یہ پرانے رسالے تھے۔ ہر ہفتے پھول اور تہذیب نسواں اور ہر ماہ عصمت کا انتظار رہتا ہے۔ والدہ کے ہمراہ تانگہ میں بیٹھ کر خراماں خراماں ریلوے روڈ لاہور اخبار پھول کے دفتر تک پہنچ کر چند کہانیوں کی نئی کتابیں خریدی جاتیں جنہیں بار بار پڑھا جاتا۔

رسالہ مخزن کی نظم والدہ کو بھی بہت پسند تھی اور وہ اس کا دوسرا مصرع سنایا کرتیں

ع: صبر کر بیٹا اب آئے گی بہار

تو عرض یہ ہے کہ اس دفعہ ماسکو میں سردی سنا ہے ۲۰ برس بعد اس قدر شدید پڑی ہے۔ دروغ بر گردنِ راوی۔ درجۂ حرارت صفر سے ۳۵ درجہ نیچے چلا گیا ہے۔ مکان کے اندر تو سردی محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ گرم رہتے ہیں۔ مگر باہر جیسے ہی قدم رکھیے کپکپی سی آجاتی ہے۔ گرم کپڑے اس قدر پہننے پڑتے ہیں کہ اندر آکر انہیں اتارنے میں کافی وقت صرف ہو جاتا ہے۔

۱۴ فروری۔ برف کا تماشہ دیکھنا ہو تو "لینن ہل" تک جائیے۔ وہاں سڑک کے دونوں طرف ماسکو یونیورسٹی کے راستے میں برف کے نشیب و فراز ملیں گے۔ راستہ میں "گورکی پارک" میں بچے آپ کو برف پر ہاکی کھیلتے ہوئے اور سکیٹنگ کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ روس میں بچوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اور ان کی پڑھائی اور تفریح دونوں کی طرف بہت توجہ ہے۔ تومند تندرست بچے ملک کی دولت سمجھے جاتے ہیں۔ یوں بھی روسی عورت مرد بچوں کو بہت پیار کرتے ہیں۔

منور ہمایوں خاں بتاتی ہیں کہ ایک دوپہر وہ اپنے بچوں کو سکول سے لے کر سڑک پر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ ٹیکسی کے انتظار کرنے والوں کی قطار وہاں بہت لمبی تھی۔ اتنے میں برف گرنی شروع ہو گئی۔ پہلے تو ان کی دائیں بائیں کی خواتین نے بچوں کے مفلر خود اچھی طرح سے ان کے سر پر لپیٹے اور پھر جیسے ہی ایک ٹیکسی آئی پوری قطار چھٹ گئی۔ اور موٹر کا دروازہ کھول کر بچیوں کو جلدی جلدی انھوں نے انھیں حفاظت سے اندر بٹھا دیا کہ جیسے وہ کوئی آبگینے ہوں — ننھے ننھے بچے سر سے پاؤں تک سمور میں لپٹے ہوئے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ اور سردی کتنی ہی ہو وہ آئس کریم ضرور کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں ماسکو کی آئس کریم یورپ بھر میں لذیذ ہے۔ دودھ تو واقعی یہاں اصلی ملتا ہے۔ اور مکھن دہی بھی۔

اس ہفتے آسٹریا میں جو موسم سرما کے کھیل ہو رہے ہیں۔ وہ شام کو ٹی وی پر باقاعدہ دکھائے جاتے ہیں۔ آسمان پر جا کر ستارے تلاش کرنے ہوں۔ یا برف کے

کھیل ہوں۔ ان کی ہمت اور محنت قابلِ داد ہے۔ علامہ اقبال نے شاید ایسے ہی باہمت افراد کے لیے کہا ہوگا:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آ ور اے ہمت مردانہ

اور غالباً یہ مولانا حالی کا شعر ہے (ٹھیک یاد نہیں)

اے ہمتِ مردانہ خبر میں تری جا ہے
مت آنکھ چرا مجھ سے اگر شرطِ وفا ہے

سرسید۔ اقبال۔ یا حالی ان سب کا پیام ایک تھا۔ نوجوان مسلم کو جگانا اور یہی پیغام ہمارے قائد نے دیا پاکستان بنا کر۔

سنا ہے یہاں بہار ماہ مئی میں شروع ہوتی ہے۔ اپریل میں برف پگھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ خیر سے موسم خوشگوار ہو تو انشاء اللہ سمرقند۔ بخارا اور فرغانہ جانے کا نیک ارادہ ہے۔ یہ سب نام میرے لیے الف لیلے کی طرح جادو کا اثر رکھتے ہیں۔ ہماری تہذیب و تمدن کے قافلے انہیں راستوں سے آئے ہیں۔ فرغانہ شہنشاہ بابر کا شہر جس نے علم و فن کی شمعیں جلا کر پورے ہندوستان کو بقعۂ نور کر دیا تھا۔ اس شہر کو خراجِ عقیدت پیش کرنا تو ہر پاکستانی کا اوّلیں فرض ہے۔

شیلے انگریزی زبان کے مشہور شاعر نے کہا تھا اور کیا ہی اچھا خیال ہے۔

سردیاں آئیں تو بہار دور نہیں ہے؟

مکتوب ماسکو
۴

بولشوئی تھیٹر کی دو صد سالہ سالگرہ

پچھلے دنوں یہاں ماسکو کے قدیم اور عظیم تھیٹر بولشوئی تھیٹر کی دو صد سالہ سالگرہ منائی گئی۔ یہ ایک تاریخی موقعہ تھا، جب ایک سرد سرمئی شام کو بولشوئی تھیٹر میں شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے رومیو جیولیٹ کا ڈانس ڈرامہ (BALLET) پیش کیا گیا۔ اس عظیم تقریب کے لیے سوویت حکومت تقریباً ایک سال سے تیاریوں میں مصروف تھی۔

بولشوئی روس کا قدیم ترین تھیٹر ہے اس کا اسٹیج بہت کشادہ ہے۔ تھیٹر کی عمارت کے اندر تماشائیوں کے لیے سات گیلریاں بنی ہوئی ہیں جہاں ہزاروں تماشائی کرسیوں پر بیٹھ کر شو سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ تھیٹر کی قدیم عمارت کی طرح اس کے صوفے، قالین، اور پردے قدیم روسی ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ تھیٹر روس کی ایک تاریخ ساز عمارت کی حیثیت بھی رکھتا ہے کیونکہ اسی تھیٹر میں انقلاب سے پہلے روس کا حکمراں زار اپنی بیوی زارینہ اور شاہی ارکان کے ساتھ رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ پیٹر اعظم کو رقص و موسیقی سے بہت شغف تھا۔ دراصل بولشوئی تھیٹر کو اسی نے فروغ دیا تھا جس طرح تاج محل کو دیکھ کر شاہجہان اور ممتاز محل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ان دونوں کی لافانی محبت کا سرور ناظرین پر ایک جادوئی کیفیت طاری کر دیتا ہے، بالکل اسی طرح اس تھیٹر کو دیکھ کر پیٹر اعظم کے عظیم الشان دورِ حکومت اور اس کی ثقافتی تہذیب کی یاد ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔

بولشوئی تھیٹر کی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کے لیے سوویٹ حکومت نے سفارت خانوں کے اراکین کو خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ تھیٹر کی عمارت رنگ برنگے قمقموں سے سجی ہوئی تھی۔ تقریباً سات بجے یہ تقریب شروع ہوئی۔ دلفریب موسیقی کی دھنوں کے ساتھ ساتھ پردہ اٹھایا گیا اور رقاصاؤں نے رقص کے ذریعے رومیو جیولیٹ کے کردار پیش کیے جسے ہزاروں ناظرین نے بے حد سراہا۔ ڈرامہ طویل تھا، اس لیے درمیان میں دوبارہ آدھ آدھ گھنٹے کا وقفہ کیا گیا۔ یہ شو روس کی ثقافتی تاریخ میں ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قسم کے ثقافتی شو کے ذریعے دوسرے ممالک سے ثقافتی وفنی تعلقات بہتر اور دوستانہ طور پر استوار کیے جاسکتے ہیں۔

بعض سفارتی تقریبات بہت خوشگوار اور صحت مند اثرات مرتب کرتی ہیں۔ یہ تقریبات دو ملکوں کو قریب تر لے آتی ہیں اور دوستانہ فضا استوار کرتی ہیں۔ وہ ایک ایسی ہی ثقافتی شام تھی جب برطانوی سفیر اپنی اہلیہ لیڈی اسمتھ کے ہمراہ پاکستانی سفارت خانے میں تشریف لائے۔ مسٹر اسمتھ ماسکو میں برطانیہ کے نئے سفیر مقرر ہوئے ہیں۔ وہ اب سے ۱۵ سال پیشتر بھی ماسکو میں اپنے ملک کی سفارتی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے یہ برطانوی وزارتِ خارجہ کے پختہ کار ڈپلومیٹ مانے جاتے ہیں۔ لیڈی اسمتھ بہت ہی خوش مزاج خاتون ہیں۔ بر سبیل تذکرہ آپ کو یہ بتاتی چلوں کہ ماسکو بھر میں برطانوی سفارت خانے سے بہتر کوئی عمارت نہیں۔ اس قلعہ نما سفارت خانہ کی عمارت بالکل کریملین پیلس کے سامنے واقع ہے۔ اس کی بالائی منزل سے کریملین کا محل، اس کے بلند و بالا مینار، اس کی سنگین فصیلیں اور سامنے بہتا ہوا دریائے ماسکو ایک بے نظیر منظر پیش کرتے ہیں۔

ماسکو پندرہ سال میں بہت بدل گیا

لیڈی اسمتھ بتا رہی تھیں کہ ۱۵ سال پہلے اور اب کے ماسکو میں بہت فرق ہے۔ شہر کی عمارتیں اب کہیں زیادہ کشادہ اور خوبصورت نظر آتی ہیں۔ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے بھی ماسکو بہت بڑا اور وسیع شہر بن گیا ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ بازاروں کی رونق اور دکانوں کی سجاوٹ میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ بازاروں میں ہر چیز بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے۔ جو ایک خوشگوار علامت ہے۔

ماسکو کا میٹرو (METRO) یعنی زمین دوز ریلوے سسٹم ترقی کی بہت خوشگوار علامت ہے۔ زیرِ زمین چاروں طرف ریلوے کی لائنوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور تقریباً تمام ترقی یافتہ ممالک میں زمین دوز ریلوے سسٹم موجود ہے۔ مگر خوبصورتی، صفائی، ارزانی اور تیز رفتاری میں سوویٹ روس کا مقابلہ نہیں۔ تقریباً تمام پلیٹ فارم سنگِ مرمر کے بنے ہوتے ہیں اور ان پر خوبصورت جھاڑ فانوس آویزاں ہیں۔ بلور کی قندیلیں ہیں اور جگہ جگہ سنگِ مرمر کے مجسمے ایستادہ ہیں۔ بجلی کی سیڑھیاں آنے جانے والوں کے لیے ہر جگہ موجود ہیں۔ "رش" کے اوقات میں ہر ایک منٹ بعد گاڑی ملتی ہے، جبکہ عام اوقات میں ہر تین منٹ بعد ماسکو سے دوسرے شہروں کو جانے کے لیے گاڑی مل سکتی ہے۔ ریل کا کرایہ بہت کم ہے۔ یعنی پانچ کوپک (روسی سکہ) جو پاکستانی کرنسی میں ۶۵ نئے پیسے کے برابر ہیں۔ پانچ کوپک کا ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد آپ اندر ہی اندر ماسکو کے ہر حصہ میں آجا سکتے ہیں۔

شہر کے بیرونی حصہ میں ٹرام اور بسیں موجود ہیں۔ ان کے کرایے بھی بہت کم ہیں، یعنی تین، چار اور پانچ کوپک، البتہ ٹیکسی ذرا مشکل سے ملتی ہے لیکن یہاں بچوں اور خواتین کا خصوصاً احترام کیا جاتا ہے۔ ٹیکسی حاصل کرنے کے لیے ہر شخص کو طویل قطار میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ اس اصول کے باوجود اگر آپ خاتون ہیں اور آپ کی گود میں یا آپ کی انگلی پکڑے کوئی بچہ چل رہا ہے۔ تب آپ کو فوراً ٹیکسی مل جائے گی۔ تیزی سے جاتا ہوا ڈرائیور بھی خواتین اور بچوں کو دیکھ کر فوراً رک جاتا ہے اور قطار میں کھڑے ہوئے لوگ بھی بڑی خوش دلی سے خاتون کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔

بچوں کی تفریح اور ان کے کھیل کود کے لیے بہت سے پارک موجود ہیں۔ یہاں خصوصاً چھٹی کے دن بچوں کے لیے حکومت کی جانب سے مختلف کھیلوں کا بہترین انتظام کیا جاتا ہے۔ بچوں کے لیے جگہ جگہ پائنیر (PINER PALACE) موجود ہیں جہاں پر خاص نرسری بنی ہوئی ہے۔ والدین یہاں اپنے بچوں کو چھوڑ کر اپنے کاموں پر جا سکتے ہیں۔ نرسری میں کئی خوش مزاج خواتین بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔

سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کے چھبیسویں کانگرس کے اجلاس کے دوران میں ماسکو دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ جدھر بھی نظر اٹھتی تھی۔ سرخ جھنڈے لہراتے دکھائی دیتے تھے۔ بازاروں چوراہوں اور سرکاری عمارتوں پر لینن کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔ یہ ایک اہم اجلاس تھا۔ ہر چہرہ ایک سوال تھا، لوگ یہ جاننے کے لیے بے تاب نظر آتے تھے کہ اس کانگرس میں کیا طے ہوتا ہے؟ غیر ممالک کے اخباری نمائندے اصغیر و کبیر غرض ہر شخص ایک "اہم" خبر جاننا چاہتا تھا۔ بہر حال اس کانگرس کے اہم اجلاس کی خبریں تو آپ تک اخبارات کے ذریعے پہنچ ہی گئی ہوں گی۔ اس میں شرکت کے لیے باہر سے آنے والے مندوبین واپس جا چکے ہیں اور ماسکو کا اپنا مزاج لوٹ آیا ہے۔ اب پھر ماسکو کی ثقافتی شامیں رونق افروز ہو جائیں گی۔ بولشوئی تھیٹر میں زندگی پھر انگڑائی لینے لگے گی اور بیلے رقاصائیں زندگی کو خوش رنگ اور دلفریب بنائیں گی۔

مکتوب ماسکو
۵

رُوسی بیلے ساری دُنیا میں بے نظیر ہے

بچپن میں پڑھا کرتے تھے ؎

اقبال اک برس جو مرا تاجِ سر ہوا — شملہ میں مجھ کو موسمِ سرما بسر ہوا

ویسے تو ماسکو میں موسمِ سرما قریب الختم ہے۔ مگر اب بھی برف کے گالے گاہے بگاہے نظر آجاتے ہیں۔ ہم جب گزشتہ جون میں یہاں آئے تو ہمایوں صاحب نے بتایا تھا کہ "ماسکو تو سردیوں میں دیکھنے کے لائق ہے۔"

ہمایوں صاحب کا تعارف درست نکلا۔ ۲۸ اکتوبر کو برف پڑتے ہی شہر کے در و دیوار بلّور کی طرح چمکتے دکھائی دینے لگے۔ دریچے سے باہر جھانکو تو ہمارا صحن چمن (برائے نام ہی) اور دفتر کے سامنے سیب کے دو درخت بلّورین نظر آتے تھے جیسے الف لیلیٰ کی کہانی کے بلّورین سیب کے درخت ہوں۔ تمام دن برف ہلکی ہلکی پھوار کی طرح پڑتی رہتی تھی۔ جیسے کوئی آرٹسٹ ہولے ہولے سے روئی دُھنکے۔ جب رات کی تاریکی میں باہر جھانکو تو دَر و بام چاندنی کی طرح دمکتے تھے۔

برف کا اصل تماشہ دیکھنا ہو تو لینن ہل پر جائیے۔ وہاں سڑک کے دونوں طرف ماسکو یونیورسٹی کے راستے میں برف کے نشیب و فراز، دائیں طرف "گورکی پارک" میں بچے برف پر ہاکی کھیلتے اور سکیٹنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ مائیں سمور کے کوٹ اور سمور ہی کی ٹوپیاں

پہنے ننھے ننھے بچوں کو سیر کراتی ملتی ہیں۔ سرخ سرخ گالوں والے ننھے ننھے بچے سر سے پاؤں تک اونی کپڑے، فر کے کوٹ اور فر کے جوتوں میں ملفوف روئی کے گالے لگتے ہیں۔

موسمِ سرما میں روسی وزارتِ خارجہ کی طرف سے سفیروں کے لیے مچھلی کے شکار کا بلاوا آتا ہے۔ یہ شکارگاہ ماسکو سے کچھ دور دریائے والگا کے کنارے ایک کیمپ میں ہے۔ ۱۸ دسمبر کو سردی غضب کی تھی۔ سجاد صاحب نے آکر بتایا کہ دوسری صبح نور کے تڑکے ہرن اور خرگوش کے شکار کے لیے روانہ ہونا ہے اور دوپہر کے کھانے تک وہیں رہنا ہے! اطالوی سفیر جو ماسکو میں نو وارد ہیں بہت کامیاب شکاری ثابت ہوئے۔ ویسے بھی وہ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔

مچھلی پکڑنے کے شوقین منجمد دریا کے کنارے سٹول لے کر بیٹھ گئے اور برف میں لوہے کی سلاخ سے سوراخ کر کے کانٹا ڈال دیا وہ گھنٹوں بیٹھے قسمت آزمائی کرتے رہے۔

سردی کے پورے موسم میں برف پر ہاکی کے میچ ہوتے رہتے ہیں۔ چیکوسلواکیہ کے ساتھ روس کی ہاکی ٹیم کا زبردست میچ تھا۔ یہاں کی ٹیم جیت گئی۔ کھیل کے میدانوں میں ہاکی اور سکیٹنگ کے علاوہ اسٹیج پر بھی آئس بیلے ہوتا ہے۔ منجمد برف پر رقص کے مظاہرے بہت دلفریب طریقے سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک تھیٹر میں پتلیوں کا تماشہ بہت دلچسپ دیکھا۔ پتلی کا تماشہ روس کی قدیم صفت ہے۔ پتلی گھر کی نچلی منزل میں ایک سو سال پہلے کی پتلیاں اور ان کی تصاویر کی نمائش دیکھی جا سکتی ہے۔

سرکس کا تماشا بھی موسمِ سرما کا ہر دلعزیز پروگرام ہے۔ سویت روس کا سرکس بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کو وزارتِ خارجہ کی طرف سے اس کی سیر کرائی جاتی ہے۔ ڈانس ڈرامہ (بیلے کا فن) تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ ساری دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ روس کی ہر جمہوریہ کے تمدن کو پیش کرنے کے لیے مختلف ڈانس ڈرامے پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ شاہکار ڈرامے موسمِ سرما میں ہی دیکھے جا سکتے

ہیں۔ اسی لیے جب محترمہ بیگم بھٹو گزشتہ گرمیوں میں یہاں تشریف لائیں تو بالشوئے تھیئٹر کے ڈانس ڈرامے نہیں دیکھ سکیں۔ کیونکہ بالشوئے تھیئٹر کے سب آرٹسٹ امریکہ کے دورے پر تھے۔ انہوں نے ایک ڈرامہ "برف کی دوشیزہ" سٹینی سلودسکی میوزیکل تھیئٹر میں دیکھا۔ بیگم صاحبہ نے اس موقعہ پر بتایا کہ وزیرِاعظم بھٹو یہاں ایک بیلے "بخشی سرائے" دیکھ چکے ہیں۔ یہ ڈانس ڈرامہ تاجکستانی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اب کی دسمبر کی چھٹیوں میں، میں رانی اور کاکو کو یہی بیلے دکھانے لے گئی تھی۔ اس کہانی کا پس منظر، کردار، انداز، بود و باش کا طریقہ اور لباس دیکھتے ہوئے اور موسیقی کو سنتے ہوئے یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کریملین ہال، کے بجائے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں بیٹھے ہیں۔ اصل میں ہم لوگوں کی تہذیب و تمدن کا تانا بانا وسط ایشیاء کی تہذیب و تمدن سے اس قدر میل کھاتا ہے کہ برجستہ علامہ اقبال کا یہ مصرعہ یاد آجاتا ہے ؎

کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

سردی کی شدت سے یہاں سبھی ڈراتے رہے۔ حسنِ اتفاق کہیے کہ سردی کا سلسلہ اس سال اکتوبر سے شروع ہوا تو اب تک جاری ہے حالانکہ یہ اپریل کا پُربہار مہینہ ہے، اپنے ہاں باغوں میں لیموں، مالٹے، نارنگی اور کینو کی کلیوں کی مسحور کن خوشبو فضا میں پھیلی ہوگی۔ کہتے ہیں اب موسم بہار کی آمد آمد ہے۔ دنیا امید پر قائم ہے۔

۲۳ اپریل کو معمارِ روس لینن کی ایک سو چھٹی سالگرہ تھی۔ اس تاریخی اور اہم تقریب کو کریملین کے کانگرس ہال میں بہت اہتمام سے منایا گیا۔ سبھی سفیر مدعو تھے۔ جناب اندروپود صاحب نے پہلے ایک عالمانہ تقریر کی۔ اندروپود صاحب سی ایس یو کے چیئرمین ہیں۔ ان کی تقریر کے بعد ایک رنگا رنگ پروگرام پیش ہوا۔ اس پروگرام میں یونیفارم میں ملبوس سکول کے پیارے پیارے بچوں نے بھی حصہ لیا۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہاں بچپن سے ہی ملک کو بنانے اور سنوارنے والوں کی محبت بچوں کے دل میں پیدا کی جاتی ہے۔ بہت نرمی اور پیار سے ان کے دل میں وطن کی محبت پیدا کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا کوئی فرد اپنے ملک کو بُرا نہیں کہتا۔ وہ اپنے ملک کی اسی طرح حفاظت کرتے ہیں۔ جیسے ہم اپنے گھر کی۔

مکتوب ماسکو

۶

تو میرے ساتھ میری جاں کہاں جائے گی

ماسکو سے یہ تحریر پڑھنے سے پہلے ناظرین رسالہ عصمت انگریزی کے مشہور شاعر کولرج کے مشہور مقولہ کے مطابق ذرا یہ باور کرلیں کہ یہ مئی نہیں اکتوبر ہے۔ ڈاک کی ستم ظریفی سے یہ خط رسالہ عصمت کے دفتر تک وقت پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ چلئے خیر دیر آید......

ہم منگولیا سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ سجاد صاحب کے بھائی محمود جنھیں عرف عام میں MAK کہتے ہیں اسی دوپہر کو اسلام آباد سے آئے تھے۔ مگر اسی وقت ڈاکٹر ہمایوں خاں کے ساتھ "ماسکو نیو سرکس" کا تماشہ دیکھنے گئے ہیں۔ تعجب ہوا۔ جی چاہتا انھیں سناؤں بطرز قوالی کہ ؎

اے تماشہ گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشہ می روی

آج شام ۵ اکتوبر محمود کو روس کا شہرہ آفاق بیلے (BALLET) دکھانے کا ارادہ ہے خوبیٔ قسمت سے آج کے ٹکٹ مل گئے۔ بیلے کے ٹکٹ لینے کے لیے یہاں کے دفتر خارجہ کو پہلے سے لکھنا پڑتا ہے اور ان کی مہربانی سے ہی ٹکٹ خریدے

جا سکتے ہیں۔

آج کریملن پیلیس کے ہال میں عظیم بالشوئی تھیئٹر کے اداکاروں کا رقص ڈرامہ ایک (ہسپانوی بیلے) DON QUIXOT ہو رہا ہے۔ بچپن میں "پھول" اخبار میں اس ہسپانوی شہ سوار اور اس کے خادم کی حماقتیں پڑھی تھیں جبکہ وہ ہوائی چکیوں پر تلوار چلاتے تھے۔

ساڑھے سات بجے ہال میں پہنچے۔ اس ہال میں بیک وقت چار ہزار تماشائی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ ہال جدید اور بہت خوبصورت بنا ہوا ہے۔ آرائش بے حد نفیس ہے۔ قالین، مخملی پردے اور مخملی کرسیاں جگہ جگہ روشنی کے لیے جھاڑ اور فانوس ہیں۔ رقص ڈراما، یعنی بیلے کا آرٹ تو روس پر ختم ہے۔ رقاصائیں اس نزاکت اور نفاست سے رقص کرتی ہیں کہ مجھے یوسف ظفر یا قیوم نظر کی وہ نظم یاد آجاتی ہے ؎

مرمر کی ناگن رقص کر

پوشاک میں رنگوں کی مناسبت اور پس منظر کے پردے جب بدلتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ہم اُس وقت کے سپین میں بیٹھے ہوں۔ وہی گلیاں، کوچے، بازار مارکیٹ اور ویسے ہی جنگل اور دیہات کے مناظر۔ حقیقت نگاری کی انتہا اسے کہتے ہیں۔

اب تو ہمارے میزبان "زہرہ" پر بھی پہنچ گئے ہیں۔ آپ کو جناب مجید ملک کی وہ نظم تو یاد ہوگی ؎

میں دور دور کی سوچ لوں　　　میں فلک کے تارے بھی نوچ لوں
مگر اے حسینۂ نازنیں　　　مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں؟؟"

چلیئے عشق نہ سہی ہمارا چھوٹا سا ملک کسی سے بھی دشمنی کا خواہاں نہیں۔ ہم تو پہلی دوسری اور تیسری دنیا سب سے دوستی کے خواہشمند ہیں۔

۶ اکتوبر۔ ماسکو کے پشکن (PUSHKIN) عجائب گھر میں نیویارک کے میٹروپولیٹن میوزیم کی تصویریں نمائش کیلئے آئی ہیں۔ یہاں کیلئے ٹکٹ آئندہ ماہ تک کے فروخت ہو چکے تھے۔ مگر عزیز بھائی محمود کی خاطر وزارتِ خارجہ کے دفتر سے بصد اصرار ٹکٹ منگوائے

اس قدیم پشکن (PUSHKIN) میوزیم کی اوپر کی منزل کے بڑے بڑے ہال قدیم مصوروں کے بے نظیر شاہکاروں سے مزّین تھے۔ رانی کو گوگیاں کی ایک تصویر بہت پسند آئی۔ خوش قسمتی سے نمائش کی منتظم خاتون نے کمال مہربانی سے اس تصویر کا پوسٹر منگوا دیا۔ اور رانی اس پوسٹر کو اپنے کمرے کی زینت آرائی کے لیے اپنے ساتھ آکسفورڈ لے گئی۔

انگریزی کی ایک خوبصورت مثل ہے A thing of Beauty is Joy for ever۔ "حسین چیز دائمی خوشی بخشتی ہے۔" آرٹ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے چاہے اسے "ماورا" کہہ لیں۔ ماورا سے ن۔م۔ راشد یاد آ گئے۔ ان کی ایک پرانی نظم "سپاہی کی دلہن" کا ایک ایک مصرعہ مدتوں دماغ میں رہا ہے۔ ع

تو میرے ساتھ میری جان کہاں جائے گی

یہ نظم دوسری جنگ عظیم میں لکھی گئی تھی۔ ن۔م۔ راشد سے ایک بار مدّت ہوئی یعقوب بھائی کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ جرمنی کے دوران ان کے بیٹے شہر یار سے ملاقات ہوئی جو کہ برسٹل کی سفارت میں کام کرتے ہیں۔

آج سات اکتوبر کو محمود ارجنٹائن گئے۔ آج عید بھی ہے۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ آج رُک جائیں کہنے لگے کیا مضائقہ ہے؟ "ایر ہوسٹس" سے ہی عید مل لیں گے بھلا ع

ایسے دن آتے ہیں کب کب

محمود کی زبانی ارجنٹائن میں پاکستان کے سفیر سعد میاں کو عید کی مبارک باد بھجوائی۔ یہ مدیر عصمت جناب رازق الخیری صاحب کے بڑے بیٹے ہیں۔ عصمت اور مدیر عصمت جناب رازق الخیری صاحب کو کون نہیں جانتا۔ یہ رسالہ ہندوستان اور پاکستان میں (WOMEN LIB) کا مخزن ہے۔ بعد میں اُن کی طرف سے جو عید مبارک کا کارڈ ملا اس کا خاکہ بھی ان کے مذاق سلیم کا آئینہ دار ہے۔

سجاد صاحب عید کی نماز پڑھنے کے لیے آٹھ بجے گئے۔ یہاں ہمارے گھر کے

قریب ہی ملکہ یوں کہئے کہ منوّر اور ہمایوں خاں کے گھر کے ساتھ ہی ایک بڑی سی مسجد ہے وہاں نماز پڑھ کر جب سجّاد صاحب اور ہمارے غلام حیدر خاں واپس آئے تو غلام حیدر کو بہت متاثر پایا۔ کہنے لگے کہ "وہاں تو ہزاروں مسلمان موجود تھے۔" "ہزاروں" پر اُس نے بہت زور دیا۔ جناب وہاں تو جگہ ہی نہیں ملتی تھی۔ سڑک پر ہزاروں مسلمان کھڑے تھے۔ مسجد بہت خوبصورت تھی۔ فرش پر عمدہ قالین بچھے ہوئے تھے اور سب نے وہاں عبا اور ترکی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔" دراصل غلام حیدر سچ ہی بتا رہا تھا۔ ماسکو میں میں تاجکستان، ازبکستان، ترکستان، قزاقستان اور آذربائیجان کے بہت سے مسلمان نظر آتے ہیں۔ سجّاد صاحب نے بتایا کہ مسجد کے امام صاحب نے جُبّہ اور دستار میں ملبوس بہت ہی فصیح و بلیغ عربی میں خطبہ پڑھا۔

اسی دوپہر عالیجناب باباجان عفوروف کی طرف سے عربی میں عید مبارک کا خط مع گرما اور انگور کی سینی کے ملا۔ آج عید کی ملاقات کے لیے سجاد صاحب کی طرف سے پاکستانی سفارت خانہ میں ایک عصرانہ بھی ہوا۔ ماسکو میں موجود پاکستانی طالب علموں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ غالباً وہ بھی شیر خرما کی دعوت سے بہت خوش ہوئے۔

اس ہفتہ ماسکو کے باغات میں دس ہزار فر کے درخت لگائے جائیں گے۔ ہر سال اتنے ہی پودے ماسکو کے اطراف کی نرسریوں سے لا کر شہر کے باغات میں لگائے جائیں گے۔ اسی وجہ سے باوجود اتنی عمارات کے شہر ہرا بھرا دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ بسیں ڈیزل کی بجائے بجلی سے چلتی ہیں۔ اس لیے لندن کی عمارات کی طرح ان کا رنگ ملگجا اور خاکستری معلوم نہیں ہوتا۔ ملگجا سے یاد آیا کہ نہ معلوم کسی شاعر کو یہ خوش فہمی ہوئی کہ ؎

ملگجی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

"پراودا" (PRAVDA) اخبار سے معلوم ہوا کہ روس میں آج پہلی بار موسیقی کو رنگین پیش کیا گیا ہے۔ الکزنڈر سکریبو۔ ایک معروف روسی موسیقار تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی نکلی ہوئی موسیقی کو رنگین لہروں کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کے سائنسداں کئی سال اس کوشش میں رہے اور اب انھوں نے اس کے گیت کی لہروں کے ساتھ اسی مناسبت کے رنگین مناظر ٹی۔ وی کی سکرین پر دکھائے۔ یہ ایک بہت دلچسپ اور حیران کن تجربہ ہے اور غالباً ہمارے غالب کے اس شعر کا ہم خیال ہو سکتا ہے ؎

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

مکتوب ماسکو

۷

سمرقند کو دیکھ کر لاہور یاد آگیا

رُومان پرور بخارا گلابوں کا شہر ہے

امیر تیمور کے شہر سمرقند کو اور بابر کے وطن فرغانہ کو دیکھنے کی تمنا مدت سے تھی۔ حسن اتفاق سے تاشقند میں اس سال فلمی میلہ ۱۶ مئی سے ۲۳ مئی تک منعقد رہا۔ اس دفعہ سجاد صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات کا عذر پیش نہ کر سکے۔ چونکہ ہمارا پاکستانی فلمی وفد وہاں ۱۶ر مئی کو پہنچ رہا تھا اس لیے ہماری شمولیت بھی ضروری تھی۔ ہم ۲۱ر مئی کو تاشقند پہنچے۔ وہاں سے ۲۳ کو عازم بخارا ہوئے اور ۲۴ر کو سمرقند۔ فارسی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ اگر کسی شیریں و شفاف چشمہ کا پانی ایک دفعہ پی لیا جائے تو کام و دہن کی سیرابی کے لیے وہاں دوبارہ ضرور جانا پڑتا ہے۔ یہی مضمون سمرقند پر صادق آتا ہے۔ اُسے ایک دفعہ دیکھ کر بقول حاتم طائی دوبارہ دیکھنے کی ہوس رہتی ہے۔

سمرقند کے بارے میں ہزاروں الف لیلوی قصے مشہور ہیں۔ واقعی یہ شہر اب تک ایک افسانوی اور رومان پرور تخیل پیش کرتا ہے۔ صدیوں سے یہ قدیم شہر زرفشاں دریا کی وادی میں واقع ہے۔ یہ دریا زرافشاں پہاڑ سے نکل کر ہرات کی وادی میں بہتا ہے۔ سمرقند کی تاریخ سکندر اعظم، عرب فاتحوں، چنگیز خاں کی بے پناہ افواج اور سامانی خاندان سے رقم ہے۔ لیکن زیادہ تر اس کا نام امیر تیمور سے وابستہ ہے۔ چنگیز خاں نے اسے ۱۲۲۰ء میں تاراج کیا۔ تیمور نے ۱۳۷۰ء میں اسے دوبارہ آباد کیا۔ تیمور کے زمانے میں اس کی

عظیم الشان سلطنت کا دار الحکومت سمرقند ہی تھا۔ اپنے ۳۵ سالہ دور میں ایک طرف تیمور دور دراز کے ملکوں کو فتح کرتا رہا جس میں ہندوستان بھی شامل تھا اور دوسری طرف اس نے سمرقند کو دنیا کا ایک لاثانی شہر بنا دیا۔ اس کے معمار دنیا کے دور دراز ملکوں سے آتے، عمدہ عمدہ عمارات بناتے۔ تیمور کو فنِ سپاہ گری کے ساتھ ساتھ پھولوں سے بھی عشق تھا خصوصاً گلاب سے، سمرقند کو اس نے گلابوں کا چمن زار بنا دیا۔ آج بھی وہاں چپہ چپہ پر خوبصورت اور شاداب گلابوں کے قطعات نظر آئیں گے۔

مؤرخ اس زمانہ کے سمرقند کو "گوہرِ شرق" کہتے ہیں۔ یعنی مشرق کا موتی۔ اب بھی میرے خیال میں یہ دُرِ بے بہا ہے۔

ہم ایک چھوٹے سے جہاز میں بخارا سے سمرقند پہنچے۔ تمام وقت دماغ میں فاتح ہندوستان ظہیر الدین بابر کا تصور آتا رہا۔ بابر ازبکستان کے شہر فرغانہ سے ۷۰ کلومیٹر دور اندجان کے خوبصورت مقام پر پیدا ہوا وہاں جانے کا پروگرام تو بنایا تھا مگر چند کاموں کی وجہ سے جا نہ سکے جس سے مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ انشاء اللہ پھر سہی۔

سمرقند کے میئر جناب اعظم جان صاحب نے بتایا کہ فرغانہ کی وادی ازبکستان میں سب سے زیادہ خوبصورت اور سرسبز ہے۔ وہاں کے گلاب اپنی دلکشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ تبھی تو شہنشاہ بابر ہندوستان جاکر تزکِ بابری میں فرغانہ کے گلابوں کا ذکر بار بار کرتا ہے۔

زیبرت خانم نے ہمیں ہوائی اڈہ پر خوش آمدید کہا۔ یہ ازبک خاتون اچھی خاصی فارسی بولتی ہیں۔ اس لیے بات چیت میں بہت سہولت ہو گئی۔ سمرقند ہوٹل میں ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم اس کے ساتھ شہر کی سیر کو نکلے۔ سب سے پہلے وہ ہمیں شہر سے کافی دور الغ بیگ کی رصدگاہ لے گئی۔ یہ رصدگاہ تیمور کے پوتے الغ بیگ نے جو کہ خود ایک بہت مشہور سائنسدان تھا بنوائی تھی۔ آج بھی اس کا ایک حصہ اسی طرح سلامت ہے۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی مشرق و مغرب کے اہل نجوم اس کے صحیح ہونے کی سند دیتے ہیں۔

امیر تیمور کے بیٹے شاہ رُخ مرزا نے اپنی سلطنت کا دارالخلافہ ہرات میں منتقل کر لیا تھا اور الغ بیگ کو سمر قند کا امیر مقرر کر دیا تھا۔ الغ بیگ نے مشہور زمانہ سائنس داں، فلاسفر، اور عالم شہر میں جمع کیے۔ اس طرح یہ شہر علوم و فنون کا مخزن بن گیا۔ آج بھی اس رصدگاہ کے ہمراہ ایک میوزیم میں سوویت یونین نے تمام قدیم سائنس دانوں اور مفکروں کی تصویریں جمع کر رکھی ہیں۔ ان میں بو علی سینا، فارابی، البیرونی اور عمر خیام کی تصاویر دیکھیں۔

اس عمارت سے ملحقہ پارک میں الغ بیگ کا مجسمہ بھی دیکھا۔ یہ رصدگاہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ہے اور اس کے دامن میں چاروں طرف گلاب اور چنبیلی کے پھول، ناشپاتی، زرد آلو، سیب آلوچہ اور شہتوت کے درختوں میں شہتوت کے باغ ہیں۔ شہتوت کے درختوں میں شہتوت ابھی کچے ہی تھے۔ انھیں دیکھ کر پاکستان بہت یاد آیا۔ اس کے بعد زیرت خانم ہمیں شاہِ زندان کے مزار پر لے گئی۔ یہ مزار سولھویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ اس کے گنبد سنگ مرمر اور فیروزی پچیکاری سے مزین ہیں۔ شروع میں بڑی سی ڈیوڑھی ہے۔ اس کے بعد محراب مغلیہ عمارات کی یاد دلاتے ہیں۔ دائیں طرف مسجد ہے۔ بائیں طرف مسافر خانہ اور خانقاہ۔ یہ خانقاہ اس وقت طالب علموں کے لیے مکتب کا کام دیا کرتی تھی۔ بخارا سے عالم آکر یہاں درس دیتے۔ چاروں طرف حجرے مسافروں اور طالب علموں کے لیے قیام و آرام کے لیے بنے ہیں۔ بہت سی کشادہ سیڑھیاں چڑھیں تو دائیں بائیں بہت سے مزارات ہیں۔ جن میں سے ایک اس بزرگ کے استاد کا ہے۔ ان سب کے گنبد نیلی پچیکاری سے منقش ہیں۔ آیات قرآنی خطِ کوفی میں بہت خوبصورتی سے کندہ ہیں۔ یہ فیروزی چمکیلی ٹائلیں اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ماند نہیں پڑیں۔ عمارت میں جا بجا سنگِ مرمر بھی استعمال ہوا ہے۔ کسی کسی جگہ سنگِ مرمر کی جالیاں اتنی نفیس اور نازک ہیں کہ فرانسیسی فیتے کا گمان ہوتا ہے۔ شاہِ زندان کی بابت ہماری میزبان نے بتایا کہ ان کی نسبت حضرت امام عباسؓ سے ہے مگر ان کو بھی صحیح بات معلوم نہیں تھی۔

ہاں مجھے یاد آیا کہ ہوائی اڈہ سے ہوٹل جاتے ہوئے سب سے پہلے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک سنگین مسجد نظر آتی ہے۔ میں نے زیرت خانم سے دریافت کیا تو اس نے بتایا اسے حضرت خضر کی مسجد کہتے ہیں۔ یہ امیر تیمور نے شہر میں داخل ہونے والے مسافروں کی رہنمائی کے لیے بنوائی تھی۔ وہ مجھے بتانے لگی (جیسے مجھے معلوم نہ ہو) کہ اسلام میں یہ پیغمبر سیدھا راستہ بتانے والے سمجھے جاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ چلیئے ابتدا تو اچھی ہوئی۔

دوپہر کا ایک بجا تھا کہ ہماری میزبان نے کہا کہ باقی سیر کھانے کے بعد کی جائے۔ ہم بادلِ نخواستہ ہوٹل واپس آئے۔ تاہم میں نے کہا کہ کچھ دیر یہاں کے بازار تو دیکھ لیں کیونکہ وہاں آج کل اسٹابری اور چیری کا موسم تھا۔ مجھے چیری بہت پسند ہیں۔ وہ ہمیں پھلوں کے بازار میں لے گئی۔ وہاں کھلے میدان میں اونچے سائبان کے نیچے ٹوکریاں لیے بہت سی عورتیں، مرد اور بچیاں پھل فروخت کر رہے تھے۔ ہم نے ندیدوں کی طرح تازہ پھل اور سبزیوں کو نظر بھر کر دیکھا۔ کیونکہ ماسکو میں یہ چیزیں یعنی تازہ پھل اور سبزیاں عنقا ہیں۔ ایک بوڑھی خاتون سے اسٹابری اور چیری خریدیں۔ اس کے علاوہ گلاب بھی خریدے۔ ایک روبل کے ایک درجن تازہ اور خوبصورت گلاب ملے۔ یقین کریں ماسکو میں ایک گلاب دو روبل میں ملتا ہے۔ (ایک روبل پاکستانی ۱۳ روپے ۵۰ پیسے کے برابر ہے) یہ مارکیٹ اور بازاریوں معلوم ہوتے تھے جیسے لاہوری دروازہ کے باہر کی دکانیں ہوں۔ یا پھر میوہ منڈی۔ ایک جگہ ایک بوڑھی عورت نان بھی فروخت کر رہی تھی۔ سجاد صاحب نے شوقیہ چار نان بھی خرید لئے۔ یہ خاص قسم کے شیر مال تھے اور ان پر روسی زبان میں سمرقند بھی لکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر جنھیں وہ بھی بقال کی دکان کہتے ہیں مصری، نبات اور گلقند قسم کی مٹھائی نظر آ رہی تھی یہاں عورتیں اور بچیاں پھولدار شلوار قمیض پہنے (جیسا کہ آج کل پاکستان میں رواج ہے) سروں کو باقاعدہ دوپٹوں سے ڈھانپے بالکل ہمارے معاشرے کی تصویر نظر آتی ہیں۔ ان کے ناموں سے بھی کان شناسا تھے۔ قریب گلی سے چند بچیاں بستے لیے مدرسہ سے آتی نظر آئیں۔ سجاد صاحب نے اپنی میزبان سے پوچھا کہ کیا ان کی تصویر لے لوں۔ اس نے جواب دیا۔ "کیا مضائقہ ہے۔" سجاد صاحب نے

ان بچیوں کو ٹھہرالیا۔ جب ان سے نام پوچھے تو انھوں نے بتایا، دلبر، گل نار۔

کھانے کے بعد تین بجے باہر جانے کا پروگرام تھا۔ باہر نکلے تو بارش خوب زوروں پر تھی۔ بارش خلافِ معمول تھی۔ ایسی اودھی اودھی گھٹا تھی جیسے ہمارے ہاں ساون بھادوں۔ ہم ماسکو سے چھتریاں لانا بھول گئے تھے اس لیے خوب بھیگے۔ پھر بھی سمرقند کی سیر بہت خوشگوار تھی۔ سمرقند کے مدرسے بھی بخارا سے کم مشہور نہیں۔ ان مدرسوں میں تین مدرسے بہت ممتاز تھے۔ پہلا: الغ بیگ کا مدرسہ، دوسرا: شہر دور کا مدرسہ اور تیسرا طلع کاری کا مدرسہ۔ الغ بیگ اور شہر دور کے مدرسے آمنے سامنے ہیں۔ ان کے درمیان طلع کاری کا مدرسہ ہے۔ یہ تینوں مدرسے ریگستان چوک میں واقع ہیں۔ الغ بیگ کا مدرسہ پندرھویں صدی میں الغ بیگ نے خود تعمیر کرایا تھا۔ باقی دو مدرسے بعد میں تعمیر ہوئے ریگستان چوک میں آڑی ترچھی اور مربع اینٹوں کا فرش ہے اور درمیان میں گلاب کی کیاریاں ہیں۔ ریگستان چوک کا نام یوں مشہور ہوا کہ چین سے آنے والے ریشم، اطلس، کمخواب اور دیبا کے تاجروں کے کارواں اسی چوک میں آکر قیام کرتے تھے۔ چونکہ یہ کارواں ریگستانوں سے گزر کر آتے تھے اس لیے اس جگہ کا نام ریگستان چوک رکھ دیا گیا۔

ان مدرسوں کے بلند و بالا دروازوں، منقش نیلے نیلے گنبدوں، پرشکوہ محرابوں اور اونچے اونچے ایوانوں سے اسلام کی عظمت اور جلال ظاہر ہوتا ہے۔ مجھے یہاں پہنچ کر علامہ اقبالؒ کی نظم "مسجد قرطبہ" بہت یاد آئی۔ ع

تو بھی حسین و جمیل، وہ بھی حسین و جمیل

مدرسہ طلع کاری میں فیروزی رنگ کے نقش و نگار کے ساتھ ساتھ سنہری گل بوٹے ایسی عمدگی سے ایک دوسرے میں پیوستہ ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گہرے نیلے آسمان پر تاروں کا جال بنا ہوا ہو یا فیروزی اطلس پر سونے چاندی کے تاروں سے کشیدہ کاری کی گئی ہے۔ ان مدرسوں کے وسیع صحن کے درمیان تالاب اور چاروں طرف گلاب اور چنبیلی کے قطعے ہیں۔ سامنے کی اونچی ڈیوڑھی اور دالان درس کے لیے استعمال ہوتے

تھے! اور چاروں طرف کی دو منزلہ عمارت میں لاتعداد حجرے طالب علموں کی اقامت کے لیے تھے۔ یہ مدرسے اس وقت تعمیر ہوئے تھے جب آکسفورڈ اور کیمبرج کا تصور تک نہیں تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں جب قائم ہوئیں تو ان میں سینکڑوں برس پہلے دینی تعلیم کے علاوہ اور کوئی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ مگر سمرقند اور بخارا کے ان مدرسوں میں دینی تعلیم کے علاوہ ہر قسم کے مروجہ علم و ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ انہی مدرسوں کے طالب علم تھے جنھوں نے حساب، الجبرا، علم نجوم، جغرافیہ، طب اور تاریخ میں دنیا اپنا نام و مقام پیدا کیا اور اپنے علم کی مشعل سے مغرب میں روشنی پھیلائی جبکہ مغرب میں ابھی لاعلمی کی تاریکی تھی۔ یہاں سے علم و ادب کے علاوہ گلاب کے پودے اور زعفران بھی صلیبی جنگوں کے دوران سب سے پہلے ہسپانیہ پہنچے۔ کھجور کا درخت بھی سب سے پہلے عبدالرحمٰن اوّل نے اندلس میں لگایا تھا۔

بارش تھم چکی تھی۔ ایک بینچ پر تین الھڑ لڑکیاں ہاتھوں میں گلاب کے خوبصورت گلدستے لیے سروں پر سرخ اور نیلے رومال باندھے، لمبی لمبی چوٹیاں کمر تک لٹکائے ہوئے نظر آئیں۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کروایا۔ پاکستان کا نام سن کر وہ مسکرائیں اور کھڑے ہو کر السلام علیکم کہا۔ ان کے نام زرنگار، زمرد اور پری چہرہ تھے۔

ہم بی بی خانم کی مسجد بھی دیکھنے گئے۔ اس کے بلند و بالا دروازے دیکھ کر فتح پور سیکری کے بلند و بالا دروازے کا خیال آگیا۔ جو اکبر نے فتح کی یاد میں بنوایا تھا۔ ممکن ہے اس کا نقشہ یہاں سے لیا گیا ہو۔ بی بی خانم امیر تیمور کی چہیتی ملکہ تھی۔ یہ مسجد اس نے امیر تیمور کی فتح کی خوشی میں اس کی غیر موجودگی میں تعمیر کرائی تھی۔ اس کے ساتھ مدرسہ اور کارواں سرائے بھی ہے۔ اس کے بعد گورِ امیر دیکھنے گئے۔ یہ امیر تیمور کا مقبرہ ہے۔ اس کے عالی شان گنبد کا رعب و دبدبہ امیر تیمور کے جاہ و جلال کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس میں بھی سنگِ مرمر، جواہرات اور سونے کے پانی سے نقش و نگاری کی گئی ہے۔ اس مقبرہ میں امیر تیمور کے استاد بھی دفن ہیں اور کچھ تیموری خاندان کے افراد بھی۔

سمرقند کے قریب ہی افراسیاب کا پرانا شہر تھا جو سکندرِ اعظم نے تعمیر کرایا تھا۔



سمرقند کا جدید شہر



ہوائی اڈہ جاتے ہوئے اس کا میوزیم بھی دیکھا۔ وقت کم تھا اس لیے دوسرے عجائب گھر نہ دیکھ سکے۔ موجودہ سمرقند کی صنعتوں میں چمڑے، سلک اور شیشے کے برتنوں کی صنعتیں مشہور رہیں۔

دو سال پہلے سمرقند کی ۲۵۰۰ ویں سالگرہ بڑے اہتمام سے منائی گئی تھی۔ یوں سمجھئے کہ اس زمانے سے آج تک اس کی رعنائی اور خوبصورتی میں کمی نہیں آئی۔ آخر کچھ تو اس کی شان وشوکت تھی جس سے متاثر ہو کر حافظ نے کس شوخی اور خوبصورتی سے اس کے متعلق کہا ہے

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل یارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند بخارارا

مکتوب ماسکو

۸

سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد

مرزا غالب نے تو اپنے ممدوح کے لیے کسی قدر مبالغہ آرائی سے کام لیا ہو گا۔ مگر اپنا تو جی یہی چاہتا ہے کہ شام و سحر یہی ورد کیا کریں کہ

اے جان تمنا

اے میرے عزیز وطن

تو سلامت رہے ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

۱۴ اگست کو ماسکو کے "ایوانِ دوستی" میں پاکستان کی خیر سے اکتیسویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ یہ عمارت تاریخی ہے اور بہت پُرسطوت، در و دیوار اور چھتیں تمام منقش ہیں۔ اور شام کے دھندلکے میں یہاں کے بلّوریں جھاڑ، فانوس آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔

سوویت یونین میں یہ بہت بھلا دستور ہے کہ یہاں ہر ملک کے یوم آزادی کی تقریب اصل دن سے دو ایک روز قبل ایوانِ دوستی کی طرف سے بہت شوق سے منائی جاتی ہے ۱۹۷۵ء میں جب ہم جرمنی سے روس آئے تو پہلی بار اسی محفل میں شریک ہوئے۔ اس سال بھی سوویت یونین کی طرف سے تو بہت دلچسپ پروگرام تھا۔ مگر مجھے کچھ کمی محسوس ہوئی کہ اپنے سفارت خانہ سے کوئی پروگرام پیش نہیں کیا گیا۔ اس دفعہ ہم

نے بھی کچھ کوشش کی اور ہماری بچیوں اور بچوں نے مل کر مختصر مگر پیاری پیاری نظمیں ساز کے ساتھ پیش کیں جنہیں حاضرین نے بہت سراہا۔

یہ مبارک تقریب ساڑھے چھ بجے شام وقت کی پوری پابندی سے شروع ہوئی۔ سجاد صاحب اور میں ہال میں پہنچے تو ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بلکہ گیلریوں اور غلام گردشوں میں بھی خواتین و حضرات منتظر کھڑے تھے۔

سجاد صاحب اور ہم سب پاکستانیوں سے وہاں کے میزبان بہت خلوص و گرمجوشی سے ملے۔ خاص طور پر وہاں سوویت یونین کے یہ معزز ارکان جمع تھے۔ مسٹر پلنکوف جو سپریم سوویٹ کے وائس پریذیڈنٹ ہیں، مسٹر باکن جو خصوصی تعمیرات کے وزیر ہیں اور مسٹر سیڈورنکوف جو سوویٹ اور پاکستان کی دوستانہ کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ یہ صاحب بہت ملنسار اور مہربان ہیں۔ آغاز مجلس میں سب سے پہلے پاکستانی قومی ترانہ اور اس کے بعد سوویٹ یونین کا بینڈ بجا۔

استقبالیہ تقریر میں صاحب صدر نے پاکستان کی حکومت اور عوام کو روس کی حکومت کی طرف سے اور عوام کی جانب سے مبارکباد دی۔ اور پاکستان کی ترقی اور بھلائی کے لیے بہترین خواہشات کا تفصیل سے اظہار کیا۔ جواب میں سجاد صاحب نے اپنی حکومت اور عوام کی طرف سے دلی شکریہ ادا کیا اور سب ہم وطنوں کی جانب سے روسی عوام کے لیے نیک تمنائیں پیش کیں۔

رسمی تقریروں کے بعد چائے شربت کے لیے مختصر سا وقفہ ہوا، اس کے بعد تفریحی پروگرام پیش کیا گیا۔ اس میں پہلے ہماری بچیاں اور بچے پاکستانی رنگا رنگ کے لباس پہنے بہت شان سے اسٹیج پر آئے۔ اوّل انہوں نے اپنا قومی ترانہ بہت پیاری دھن میں پیش کیا ؏ شاد باد منزل مراد!

اس میں یاسمین نصر، ریحانہ منتظر، یاسمین ام، فرزانہ خاتون، شائستہ خالق، ناہید صدیقی اور ریحانہ دُرّانی شامل تھیں۔ چھوٹی سی طلعت اقبال نے میرے اصرار اور گڑیا کے وعدہ پر آج جھم جھم کرتی ہوئی قمیض شلوار پہن رکھی تھی اور ننھے فرحان پاشا بھی پاکستانی کرتا شلوار اور

صدری میں بہت معزز دکھائی دے رہے تھے۔ ہمارے قومی ترانے کو حاضرین نے بہت پسند کیا اور بہت تالیاں بجیں۔ اس کے بعد اپنی بچیوں نے میٹھی سی آواز میں " سوہنی دھرتی " کا لوک گیت گایا، یہ گیت مجھے اس قدر پسند ہے کہ واقعی اس کے ہر مدھر بول پر نثار ہو جانے کو بے اختیار دل چاہتا ہے۔

اس گیت کے بعد محسن خالق اور خالد صدیقی نے دو پاکستانی مقبول عام دھنیں عمدگی سے پیش کیں۔ شادمانی کے ان نغموں اور گیتار کی سُریلی دھنوں سے اس قدیم اور پُر شوکت ہال کی فضا گونج اٹھی۔ اور وہاں بیٹھے ہر پاکستانی کی تمنائیں جاگ اٹھیں۔

مجھے ۳۰ سال قبل واشنگٹن میں پاکستان کی پہلی سالگرہ یاد آگئی۔ اس دن میری فرمائش پر ہمارے سفیر صاحب نے اپنے سفارت خانہ کے بچوں کے لیے سالگرہ کا کیک بنوایا تھا۔ اور اس پر ایک خوبصورت جگمگاتی موم بتی روشن کی تھی۔

ہمارے پاکستانی پروگرام کے بعد روسی فنکاروں نے رقص و سرود کا بہت اچھا پروگرام ایک گھنٹہ تک پیش کیا جس میں بیلے رقص کاسک رقص، پیانو اور وائلن نوازی اور گلوکاری، موسیقی اور آرکسٹرا کی دھنیں شامل تھیں۔ سب ہی فنکار ممتاز اور اپنے اپنے فن میں ماہر تھے۔

دیارِ غیر میں یہ ایک بہت مبارک اور یادگار شام تھی۔ ہم سب پاکستانی اس خوشی کی محفل کے لیے جو ہمارے وطن کے اعزاز میں پیش کی گئی۔ سوویت یونین کے ایوان دوستی کے معزز ارکانِ کمیٹی کے بے حد مشکور ہیں۔ پاکستان پائندہ باد

مکتوب ماسکو
۹

روس کے چند قدیم شہر

۲۰ جولائی کو میں اور ریحانہ انگلستان سے ماسکو پہنچے۔ لندن، آکسفورڈ اور کیمرج میں سات ہفتہ گزارے اور اس تمام عرصہ میں وہاں اتنی گرمی رہی کہ ع

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

محترمہ سیماب قزلباش سے لندن کے سفارت خانہ میں کئی بار ملاقات ہوئی۔ انہی سے نقوش کا سالنامہ پڑھنے کو ملا۔ نقوش کے اس نمبر میں قرۃ العین حیدر کے ایک مضمون کو بہت دلچسپ پایا۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ ان کے والد محترم اور خیالستان کے مصنف سجاد حیدر کا طرزِ نگارش کتنا لطیف اور اچھوتا ہے۔

یہاں کے فارن آفس کی طرف سے چند قدیم شہروں کی سہ روزہ سیر کا پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ ۲۹ جولائی کو صبح سوا دس بجے تمام سفیروں کو ریل گاڑی سے جانا تھا۔ ہمیں سجاد صاحب چچا چھکن کی طرح سوا آٹھ بجے ہی اسٹیشن پر لے کر پہنچ گئے۔ ان تین دنوں کے قلیل عرصہ میں سوویت یونین کے قدیم ترین شہر روستوف، یاروسلاول (ROSTOV VAROSLAVL) اور پیری سلاول زالسکی (PERESLAV ZALESKY) کی سیر کی۔

یہ تینوں شہر گیارھویں سے سترھویں صدی تک قدیم روسی تہذیب کے اہم مراکز تھے۔ اس دوران میں منگولوں کی یورش سے انہیں بہت نقصان پہنچا۔ آج بھی ان کے پرانے کلیساؤں

اور عجائب گھروں میں قدیم آرٹ کے ان گنت نمونے نظر آتے ہیں۔ سنہری منقش اور مذہبی تصاویر جنہیں آئی کنس ICONS کہتے ہیں قیمتی الماس، زمرد اور یاقوت سے مزین ہیں اور جواہر نگار طلائی زیورات سونے چاندی کے ظروف، نادر قلمی نسخے، تصاویر، قدیم فرنیچر، قالین، جھاڑ فانوس، شمعدان، بلور اور چائنا کے نازک برتن بے شمار خزانے ہیں۔

شہر یاروسلاول ۱۰۱۰ء میں شہزادہ یاروسلاول مُدری نے آباد کیا تھا۔ مُدری (MUDRI) کے معنی "دانش مند" کے ہیں۔ یہ سرسبز شہر دریائے والگا کے کنارے دریائے کٹوروسل KATOROSAL کے سنگم پر آباد ہے۔ سولہویں صدی میں اس کا عروج تھا۔ اس کے مشہور مصوّر اور معمار دُور دُور شہروں میں جاکر نقش و نگار بنایا کرتے تھے۔

یہاں کی راہب گاہ تاریخ میں بہت مشہور رہی ہے۔ اس کا گرجا سوویت یونین کا قدیم ترین گرجا گھر ہے۔ اس راہب گاہ اور کلیسا کے کلس، محرابیں اور ستون اپنی اپنی جگہ ربک اور موزوں ہیں۔ ساتھ ہی راہبوں کے حجرے قطار اندر قطار ہیں۔ کلیسا کے دالان در دالان اندر سے تنگ اور تاریک ہیں۔ ان میں مسجد کی سی کشادگی نہیں کلیسا کے باہر بڑا صحن چمن ہے۔ ارد گرد اور چار دیواری تک گنجان درخت۔ اس کا گھنٹہ گھر، باہر کی ڈیوڑھی اور بڑا دروازہ بھی پُرشکوہ ہیں۔ چار دیواری فصیل کی مانند ہے جس پر جابجا پہرہ کی چوکیاں بنی ہیں گویا قلعہ کی ہوں۔ ان مذہب کے پاسبانوں کو اپنی حفاظت کی ضرورت بھی تھی۔

سفیر سب کے سب اپنے اپنے کیمرے لے کر گئے تھے۔ سفیر برما کا کیمرہ سب سے اچھا تھا۔ سعد اور ریحانہ بھی اپنے کیمروں سے تصویریں لیتے رہے۔ رئیس استقبال مسٹر نگی پروف کے ہمراہ ان کی بیگم اور بیٹی بھی تھیں۔ ان کی بیگم انگریزی اور فرانسیسی آسانی سے بول لیتی ہیں اور بیٹی آئرین (IRENE) پیاری سی لڑکی ہے۔ ریحانہ سے اس کی کافی دوستی ہوگئی۔ خوش قسمتی سے سعد کے ساتھ سفیر اردن کا معاذن تھا۔ ان دونوں کی دوستی دہلی سے ہوئی جہاں دونوں برٹش اسکول میں پڑھا کرتے

تھے۔ ان دونوں کی گاہے گاہے شرارتوں سے سفر کی تھکن محسوس نہیں ہوئی۔ بس میں کولمبیا کے سفیر ان دونوں کے قریب بیٹھے تھے جو ذرا پریشان نظر آرہے تھے۔

---

۲ بجے ہماری ریل یاروسلاول پہنچی۔ ہوٹل پہنچ کر کھانا کھاتے ہی ۳ بجے بس میں نکل پڑے۔ سب سے پہلے شہر کے میئر سے ملاقات کے لیے یاروسلال ریجنل سوویت کی شاندار عمارت پہنچے۔ وہاں تقاریر کے سلسلہ کے بعد شہر کے گرجا گھر، میوزیم، خوبصورت پارک اور ڈیزل انجن بنانے کا کارخانہ دیکھا جو بہت بڑا ہے۔ یہاں کے بنے ہوئے ڈیزل انجن پاکستان بھی جاتے ہیں اس کا انکشاف سجاد صاحب نے کارخانے کے چیف انجینئر کے سپاسنامہ کے جواب میں شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا، اس کارخانہ میں کام کرنے والوں کی تفریح گاہ (PALACE OF CULTURE) کہلاتی ہے اور بہت وسیع اور شاندار ہے۔

یہ شہر روس کے سرسبز ترین خطہ میں آباد ہے۔ اس لیے جگہ جگہ دریا کے کناروں اور باغوں میں ایک ہجوم گل ولالہ نظر آتا ہے ؎

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

(اقبالؒ)

اس شہر کی ایک اور تاریخی عمارت یہاں کے مشہور انقلابی شاعر نکراسوف کا کنٹری ہاؤس ہے۔ یہ شاعر دریائے وولگا کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹرشودا میں پیدا ہوا تھا۔ اب اس گاؤں کا نام نکراسوف ہے۔ اس کی شاعری میں دو پہلو بہت نمایاں ہیں۔ ایک دریائے وولگا کے کشتی بان (آپ نے بھی غالباً بچوں کی پیانو کی کتاب میں وولگا کے کشتی بانوں کا گیت سنایا بجایا ہوگا) دوسرا روسی عورت کی عظمت۔ اسی لیے روسی عورتیں اس شاعر کو اپنا ہیرو سمجھتی ہیں۔ اس کا یہ گھر جو اس نے زار کے زمانے میں شہزادہ سے خریدا تھا۔ دریائے وولگا کے کنارے ایک سبزہ زار کے وسط میں ہے۔ یہ قدیم طرز کی دو منزلہ عمارت اس نے مانے

کے خوش وضع فرنیچر سے آراستہ ہے۔ اب اس کے ہر کمرے میں شاعر موصوف کی ذاتی چیزیں، کتابیں، تصویریں، قالین، یہاں تک کہ اس کے قلم دوات اور لکھنے کے کاغذ بھی موجود ہیں۔ اس کے سب گیتوں اور نظموں کو نہایت احتیاط اور خوبصورتی سے فریم کیا گیا ہے۔ ہر سال اس گھر سے متصل باغ میں والگا کے کنارے شاعر کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔ سوویت یونین کے دور افتادہ گوشوں سے شاعر، اہل قلم اور موسیقار یہاں جمع ہو کر اس عظیم شاعر کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ زندہ قوموں کا یہی قرینہ ہے۔

پہلی خلا باز خاتون کا مکان

یہاں ضلع کے ایک گاؤں سے گزرے جہاں میڈم والنیتنا پہلی خلا باز خاتون پیدا ہوئیں اور وہیں کے اسکول میں تعلیم پائی۔ اس چھوٹے سے مکان کو اسی حالت میں محفوظ کر کے میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ اس میں دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں اور ملحقہ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ میں ایک میز، دو تین معمولی کرسیاں، لکڑی سے جلنے والے چولہا اور اس پر دو چار فرائی پان اور صرف دو ایک دیگچیاں رکھی ہوئی ہیں۔ طاق میں ایک بوسیدہ سا سماوار ایک کیتلی رکھی ہے۔ اس مکان کے ساتھ ساتھ ایک نئی عمارت ہے جس میں اس خلا باز خاتون کی اسکول سے لے کر ہوابازی کی ٹریننگ تک کی تصویریں مختلف یونیفارموں میں، کتابیں اور سرٹیفکیٹس محفوظ ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں یہ خاتون جس راکٹ کے ذریعہ خلاء میں پہنچی تھیں، وہ مع اسٹیپنگ اور کیپسول کے وہاں موجود ہیں۔ جو کپڑے خلاء میں استعمال کیے تھے وہ بھی رکھے ہوئے ہیں۔ خلاء سے واپسی پر جو اعزازات اور میڈل ان کو دیئے گئے تھے وہ بھی ایک الماری میں محفوظ ہیں۔

ستاروں کو چھونے والی یہ خاتون واقعی خواتین عالم کے لیے باعث فخر ہیں۔ گزشتہ سال بیگم بھٹو صاحبہ کی ماسکو آمد پر جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا تھا کہ ان کی بچی کو خلا کے سفر کے بعد پیدا ہوئی۔ پیانو اور پینٹنگ کا بہت شوق ہے۔ اس کا ثبوت یوں ملا کہ اس میوزیم میں اس بچی کی تصویر پیانو بجاتے ہوئے دیکھی اور ایک کارڈ بھی جس پر اس نے چند پھول بنا کر اپنی ماں کو سالگرہ کی مبارک باد دی ہے۔

شام کے آٹھ بجے ہم دریائے والگا کے کنارے پہنچے اور کشتی کی سیر کی۔ دوران سفر مصر کے سفیر کی بیگم فاطمہ سے جو میرے قریب بیٹھی تھیں۔ "دنیل کی سرحد سے لے کر تا بنجاک کا شغر" تبادلۂ خیالات رہا۔ نو۹ بجے دریا کے کنارے پہنچے اور ساڑھے نو بجے بمشکل ہوٹل ــــــــــــ

۳۰ جولائی۔ رات میں گرمی اور تھکن سے دیر تک نیند نہ آئی۔ تاہم صبح اٹھنا ہی پڑا اور برائے نام ناشتے کے بعد قدیم شہر روستوف اور اگلچ دیکھنے چلی۔ غلطی یہ کی کہ کل کی دھوپ کے دھوکے میں برساتیاں اور چھاتے ہوٹل چھوڑ آئے۔ ابھی آدھا راستہ طے کیا تھا کہ اودی اودی گھٹائیں چھا گئیں اور دھواں دھار بارش ہونے لگی۔ اب جو اگلچ کا مشہور گھڑیوں کا کارخانہ دیکھنے اترے تو چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ اترنے اور لاتعداد سیڑھیاں چڑھ کر ایک وسیع صحن باغ سے ہوتے ہوئے کارخانہ کی ڈیوڑھی تک پہنچتے پہنچتے ہم بالکل شرابور ہو گئے۔ وہاں اسی حالت میں پھر شربت پیا اور ایک فلم گھڑیوں کے متعلق دیکھی۔ چند بیگمات نے گھڑیاں خریدیں اور جب واپس بس کی طرف چلے تو بارش کی ستم ظریفی کا اندازہ دیکھا

ع " یہ کہہ دو ابر باراں سے اگر برسے تو یوں برسے"

اگلچ شہر میں کلیسا بھی بہت قدیم اور خوبصورت ہیں اور ان کے ۷۵ء ۸ ر بھی سچے موتیوں اور جواہرات سے مزین ہیں۔ حضرت مریم کی کئی تصویریں مشرقیت کا عنصر لیے ہوئے تھیں۔ سنہری گوٹ لگی نیلی ردا سے ڈھکا سر، سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں، چہرہ پر معصومیت اور حیا کی دمک۔ کئی تصاویر میں ہمارے چغتائی آرٹ کی جھلک نظر آئی۔ ایک میوزیم میں بڑے پادریوں کی قدِآدم تصویریں دیکھیں جو سچے موتیوں اور ریشم کی کشیدہ کاری سے بنی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک نایاب تصویر ملکہ کیتھرین نے وہاں کے بڑے گرجا گھر کو بطور ہدیہ دی تھی۔ ان قیمتی چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عیسائی مذہب کے نگہبان یعنی اہلِ کلیسا کا اوڑھنا بچھونا زر و جواہر دیبا اور اطلس رہا ہے۔

روستوف کے چھوٹے سے شہر میں کہیں زیادہ نوادرات موجود ہیں۔ روسی تاریخ کے مطابق اس شہر کی بنیاد ۸۸۳ء میں رکھی تھی۔ اس وقت دور دراز کی بازنطینی حکومت بھی اسے

خراج دیا کرتی تھی۔ لیکن پھر بارہویں صدی میں یہ شہر بھی چنگیز خاں کے دامنِ تسخیر میں آیا۔ تیرھویں صدی میں یہ شہر ماسکو کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اسی صدی میں اسے پھر عروج ہوا اور یہاں سب سے پہلے کریملن (KRAMLIN) اور (CATHEDRAL OF ASSUMPTION) تعمیر ہوا اور بلند و بالا گھنٹہ گھر چھوٹے بڑے کئی گرجا، بڑے پادریوں اور شہزادوں کے شاندار محلات تیار ہوئے۔ روستوف کی کریملن کی عمارت ۱۶۶۰ء سے ۱۶۹۰ء تک یعنی ۳۰ سال میں تعمیر ہوئی۔ اس کے گرجا گھر کے گھنٹوں کی آواز بہت سریلی ہے۔ ان گھنٹوں کو ڈھالتے وقت سیسہ میں برابر کی چاندی ملائی گئی ہے۔ اب سیاحوں کے لیے ان آوازوں کے ریکارڈ ملتے ہیں۔ آغائے سفیر افغانستان نے ایک ایسا ریکارڈ خرید کر سعد کو تحفتہً دیا۔ یہ نام انہیں بہت پسند ہے اور وہ اسے پیار سے مسعودِ سلیمان پکارتے ہیں۔ ۱۸۸۴ء میں ایک مشہور مورخ استوسوف نے پیٹرس برگ میں ایک کتاب لکھی تھی۔ " روستوف کے گھنٹے اور ان کی موسیقی "

---

۳۱ جولائی کی صبح کو ہم ایک مشترکہ ڈیری فارم میں گئے اور وہاں سے پنیر بنانے کی فیکٹری میں، ڈیری فارم سے تازہ دودھ پائپ کے ذریعے پنیر فیکٹری میں پہنچایا جاتا ہے۔ جو کافی دور ہے۔ اس فیکٹری میں پنیر جدید طریقوں سے بنایا جاتا ہے۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہاں ۱۰۰ سے زیادہ قسم کا پنیر بنتا ہے۔ سن کر تعجب ہوا۔ اسی طرح ایک مرتبہ بغداد میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک نخلستان میں ایک اچھے دوست حافظ قاضی سے یہ معلوم ہوا کہ عراق میں کھجور کی ۲۰۰ اقسام ہیں۔ ایک خوش کن انکشاف ہوا تھا۔ باہر جا کر معلومات اور تجربے میں کچھ تو اضافہ ضرور ہو جاتا ہے ؎

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اس دیس پردیس کی ملازمت میں مجھے محترم شیخ عبدالقادر کا لکھا ہوا دسویں جماعت کے اردو نصاب کا مضمون اکثر یاد آتا ہے ع
" گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو "

فیکٹری دیکھنے کے بعد پنیر چکھنے کو بھی ملا۔ میزوں پر بلور کی صراحیوں میں تازہ لسی بھی تھی جس تک ہماری رسائی نہ ہوسکی وہاں کئی پیاسے ہم سے زیادہ حقدار تھے۔ پنیر البتہ مزے کا پایا۔ ایک بجے روستوف کریملین کے سرخ ہال میں وہاں کے گورنر کی طرف سے لنچ تھا۔ سرخ کے معنی روسی زبان میں خوبصورت کے ہیں جو ہمیں وہاں کے گائیڈ نے بتایا۔ اس قدیم گرجا کے سامنے ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔ اس کو تالاب کہہ لیجئے۔ اس کے اردگرد چمن ہے اور چمن کے ساتھ لائبریری کی بلند و بالا سیڑھیاں ہیں اٹھا کر دیکھا تو ایک حسینہ قدیم روسی لباس پہنے سر پر سچے موتیوں کا تاج رکھے خراماں خراماں اٹھلاتی ہوئی ان سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہے گویا آسمان سے کوئی کہکشاں اتر کر ہم خاک نشینوں تک رسان سے پہنچ رہی ہے یا جیسے کوئی رنگین نغمہ ہو۔ ایک ہاتھ میں چاندی کی قاب میں روستوف کا روائتی نان یا شیرمال کہہ لیجئے مشتری کی طرح گول، بیچ میں چاندی کے نمکدان میں نمک تھامے دوسرے ہاتھ میں جلتا ہوا شمع دان دھرتی پر قدم رکھتی ہوئی سب سے پہلے سفیر لبنان کو نان پیش کیا کیونکہ وہ سب سے سینئر سفیر ہیں۔ انہوں نے ایک لقمہ نان کا توڑ کر نوش جان کیا۔ بعد میں باری باری شمع دان اور نان کا قاب سب کے سامنے آیا۔ یعنی یہ بلاوا تھا کہ آیئے تو آم کھائیے۔ مہمان نوازی کی یہ رسم روستوف کی قدیم روایت ہے! اردو زبان میں نمک خواری اور نمک حلالی کا ماخذ ایسی ہی روایات ہوں گی۔

اندر سرخ ہال یا خوبصورت دالان میں کھانے کی لمبی لمبی میزیں گلدستوں سے سجی تھیں۔ دیواروں پر شمع فروزاں۔ لکڑی کی منقش چھت سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ بچوں میں سعد اور ریحانہ کے علاوہ آئس لینڈ کے سفیر کا گیارہ سال کا بیٹا، سفیر اردن کے دو بیٹے اور رئیس استقبالیہ کی لڑکی شامل تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ کھانے کے وقت سنجیدہ رہیں چونکہ یہاں تقاریر ہوں گی پہلے روسی زبان میں اور پھر انگریزی اور فرانسیسی میں باری باری ان کا ترجمہ ہوگا تم لوگ خاموشی سے سننا۔ اب جیسے ہی کھانا کھلانے والی خادماؤں نے مؤدبانہ بلوری گلاسوں میں شربت انڈیلا اور میزبان نے کھڑے ہو کر سب مہمانوں کا جام صحت تجویز کرتے ہوئے تقریر شروع کی تو آئس لینڈ کے سفیر کے بیٹے کو چھینک آگئی اور اس سنجیدہ اور مہذب پس منظر میں

اس کے چھینکتے ہی ریحانہ سعد معاذن اور رینا نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں ان کے قریب تھی مجھے ہنسی روکنا بہت مشکل معلوم ہوا اور سجاد صاحب سے بھی ڈر تھا۔ اب شامت آئی۔ معاذن کے بڑے بھائی منذر نے اس کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت گھورا اور تنبیہہ کی مگر معاذن جیسا چلبلا اور دلچسپ لڑکا بھلا کب باز آتا۔ کچھ بھی ہو اس ہنسی کی بدولت میرے سر کا درد غائب ہو گیا۔ میرے دائیں طرف ترکی کے سفیر بیٹھے تھے جو بہت خوش طبع انسان ہیں وہ بھی زیر لب اس شرارت سے لطف اٹھاتے رہے۔ کہنے لگے "منذر کچھ زیادہ ہی چھوٹے بھائی پر رعب جما رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تبھی تو شیخ سعدیؒ نے کہا ہے کہ ع

سگ باش برادر خورد مباش

بہر کیف کھانا اچھا تھا۔ شوربہ یہاں کا مخصوص تھا اور آئس کریم بھی تازہ اسٹابری کے ساتھ تھی۔ لنچ کے بعد پھر یہاں سے کوچ ہوا۔ آج بارش کی وجہ سے موسم کھُلا کھُلا اور ہوا خنک تھی۔ ہماری بس پیری سلاول زالسکی (PSRELAVL - ZALESKY) کے جنگلوں اور وادیوں میں سے گزرتی ہوئی ایک جھیل کے کنارے کی یہاں سر سبز پہاڑی پر ایک چھوٹا سا میوزیم ہے جس کا نام پیٹر اعظم کی کشتی ہے۔ زار پیٹر اعظم نے اس جھیل (TERECHVOVA) میں سب سے پہلے کشتیاں بنانی شروع کی تھیں! اور یوں اس قوم کی کشتی رانی کا آغاز اسی جھیل سے ہوا۔ اس عجائب گھر میں پیٹر اعظم کی بنائی ہوئی ہے۔ ایک کشتی اصلی حالت میں نمائش کے لئے رکھی ہوئی ہے مع ان رسوں اور مختلف کشتی بانی کے چپوؤں اور اوزاروں کے۔ دروازہ کے باہر دو بڑے بڑے لنگر بھی اسی انداز میں یوں بحر ظلمات میں تو ہماری قوم نے بھی گھوڑے دوڑا دیئے تھے نامعلوم وہ سیماب پا رفتار وقت کی آندھیوں میں تھم کیوں گئے گئے

وہ غازی وہ تیرے پُراسرار بندے!

ہماری بس پیری سلاول کے خوبصورت شہر کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ماسکو کی طرف دوڑتی رہی، راستے بھر دونوں طرف کے مرغزاروں میں ایک بارہ سنگھا بھی کسی کو نظر آیا ویسے

چھوٹے چھوٹے گاؤں صاف ستھرے کھپریلوں والے چھوٹے چھوٹے مکانوں کے دالانوں میں مرغیاں دانا چنتی نظر آئیں۔ کھیتوں میں ہری ہری دوب چرتی ہوئی گائیں، ندی نالوں میں تیرتی ہوئی مرغابیاں قیں قیں کرتی بطخیں سب رواں دواں رہے۔ ایک گاؤں میں ایک بوڑھے کو لب سڑک لکڑی کے بنچ پر بیٹھے بچے کو گود میں لیے غالبًا کہانی سناتا ہوا دیکھا۔ دوسرے مکان کے صحن میں تین پیاری پیاری بچیاں اور ان کی بابشکا زنانی (دادی، اماں) ہمیں دیکھ کر رنگین رومال ہلاتی رہیں۔ پھر شہر کے کلیساؤں کے اونچے اونچے کلسوں کو چمکتا دمکتا اور سنہری گنبدوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم لوگ ماسکو کے مضافات سے گزر کر ۹½ بجے لال چوک پہنچے اور فارن آفس کے میزبان کا اس دلچسپ سفر کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے ۱۰ بجے تک سدوداکدرنس کا یا پہنچ گئے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

مکتوب ماسکو
۱۰

اِک ذرا لینن گراڈ تک

یہاں نازیوں کو شکست فاش ہوئی

۳۱؍ اگست کی شام کو ہم بذریعہ ریل لینن گراڈ روانہ ہوئے۔ میں نے اور سجاد صاحب نے گذشتہ سال بیگم بھٹو صاحبہ کی ہمراہی میں لینن گراڈ دیکھا ہے۔ مگر اس دفعہ ریحانہ اور سعد کو یہ تاریخی شہر دکھانا ضروری تھا۔ آکسفورڈ میں ریحانہ نے یورپین تاریخ لی ہوئی تھی جس میں رُوس کی قدیم تاریخ بھی شامل تھی۔ یوں بھی لینن گراڈ ایک قابلِ دید جگہ ہے۔ پہلے اس کا نام "پیٹرز برگ" تھا۔ یہ خوبصورت شہر دریائے نیوا کے کنارے آباد ہے۔ گذشتہ سال بھی یہ بہت خوبصورت معلوم ہوا تھا مگر اس سال بارش کی زیادتی سے سبزے کی فراوانی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہاں اس قدر بارش سو سال کے بعد ہوئی ہے۔ اس کے برعکس مغربی یورپ اور برطانیہ میں خشک سالی رہی۔ "بارانِ رحمت ہے جہاں چاہے برسے اور جہاں چاہے نہ برسے"۔ (بقول ابنِ انشاء صاحب)

پہلی ستمبر کی صبح ۲۵-۸ پر ریل گاڑی لینن گراڈ پہنچی۔ وہاں ریلوے اسٹیشن پر ہمیں لینے کے لئے مسٹر ایفی موف اور مادام ایلا ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھامے موجود تھے۔ مادام ایلا ہماری ترجمان تھیں جو انگریزی بڑی روانی سے امریکیوں کی طرح بولتی ہیں اور کئی بار انگلستان ہو کر آئی ہیں۔

لینن گراڈ میں ہمارا قیام ہوٹل اسٹوریا میں تھا۔ اس ہوٹل کی عمارت قدیم طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس خوبصورت ہوٹل کی خوابگاہ میں فرنیچر بھی قدیم فرنچ طرز کا ہے۔ مختصر سا

ناشتہ کرکے پونے دس بجے سجاد صاحب اور بچے ایوانِ دوستی چلے گئے۔ وہاں مادام لیبوتووا کو منتظر پایا۔ یہ خلیق خاتون گذشتہ سال بیگم بھٹو کو خوش آمدید کہنے کے لئے ایوانِ دوستی میں موجود تھیں۔ اُنہوں نے بیگم بھٹو صاحبہ کے لئے سلام کہا۔ وہاں ان کی تقریر اور سجاد صاحب کے جوابی شکریے کی تقریر کے بعد کافی کا دَور چلا۔ سعد میاں نے بھی مروّت میں آکر خلافِ معمول دو پیالیاں کافی پی ڈالی۔ ہوٹل اسٹوریا میں ڈبل روم کا کرایہ ۳۵ روبل یومیہ ہے جو کہ بہت ہی مہنگا ہے (ایک روبل = ۳۰،۱۳ روپے)

ایوانِ دوستی سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر شہر کا ایک چکر لگایا۔ موٹر میں بیٹھے بیٹھے دریائے نیوا کے کنارے کی مشہور عمارتیں، لینن گراڈ کا قدیم شہر، جہازرانی کی اکیڈیمی جسے پیٹرِ اعظم نے شروع کیا تھا۔ پیٹر اور پوَل کا قلعہ دیکھا۔ ایک بجے واپس آکر ہوٹل کے ریستوران میں کھانا کھایا۔ خوش قسمتی سے ہماری میز کا خدمتگار جرمنی زبان جانتا تھا اس لئے سعد نے کھانے کے مینو (MENU) کے بارے میں ہماری ترجمانی کی۔ مجھے تو کھانے سے زیادہ ہماری میز پر رکھا ہوا ہمارا چاند ستارے والا جھنڈا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اپنے اس پرچم کو دیکھ کر بے ساختہ عبدالرحمن اوّل کا وہ شعر یاد آگیا جو انہوں نے اندلس میں اپنے لگائے ہوئے کھجور کے درخت کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ اور جس کا عربی سے ترجمہ علامہ اقبالؔ نے یوں کیا ہے ؎

میری آنکھوں کا نُور ہے تُو میرے دل کا سُرور ہے تُو
اپنی دُنیا سے دُور ہوں میں اپنی دُنیا سے دُور ہے تُو

خدا کرے ہمارا یہ پرچم تا ابد اُونچا اُڑے۔

کھانے کے بعد ہم نے پیٹرڈووسکی کا رُخ کیا۔ یہ گاؤں لینن گراڈ سے ۶۰ میل دُور ہے۔ راستے میں سڑک کے دونوں طرف سرسبز پارک اور ہرے بھرے جنگل نظر آئے۔ تقریباً نصف فاصلے کے بعد مادام ایلا نے بتایا کہ دُوسری عالمگیر جنگ میں اس جگہ تک جرمن فوج قابض تھی۔ اس مقام سے رُوسی فوج نے انہیں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اس مقام پر ایک خوبصورت یادگار بھی تعمیر ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جرمن فوج نے لینن گراڈ کا نوسو دن تک محاصرہ رکھا۔ لیکن یہ رُوسی فوج اور رُوسی قوم کی ثابت قدمی اور اولوالعزمی کی دلیل ہے کہ اُنہوں نے

دشمن کا محاصرہ ناکام کر دیا اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

پیٹرڈووسکی پیٹراعظم کا موسم گرما کا محل ہے اس کے آس پاس اُمراء، وزراء اور رؤساء کے محلات ہیں۔ پیٹراعظم کو جہاز رانی کا بہت شوق تھا۔ اس لئے یہ محل گلف آف فن لینڈ کے عین سامنے بنوایا تھا۔ اس کے بعد ملکہ کیتھرائن اوّل اور دوئم کے زمانہ میں وہاں امیروں اور سفیروں کے محلات اور باغات بنوانے کا سلسلہ جاری رہا۔ جن کے آثار آج بھی باقی ہیں۔

اس محل میں دُوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جرمن فوج نے اپنا ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر جنگ کے بعد ایسے محلات اور تاریخی مقامات کی تباہی اور بربادی جنگ کا لازمی حصّہ ہوتی ہے۔ ہماری ترجمان نے بتایا کہ محل کی نچلی منزل کے منقش اور سنہرے دالانوں میں جرمن سپاہیوں کے گھوڑے باندھے جاتے تھے۔ اس سے پھر مجھے یاد آیا کہ لاہور کا قلعہ اور بادشاہی مسجد بھی سکھ فوجوں کے گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ جنگ چاہے کسی زمانے میں ہو۔ اسے مہذّب یا ایک احسن عمل نہیں کہا جاسکتا۔

اس محل کی عمارت تو کوئی خاص نہیں ہے لیکن اس کا فرنیچر، سونے چاندی کے ظروف، قالین اور تصویریں نہایت خوبصورت اور نایاب ہیں۔ جن میں وہ تحائف بھی شامل ہیں جو مغربی ممالک نے پیٹراعظم کے لئے بھیجے تھے۔ محل کے دائیں بائیں سفید اور سنہری کلسوں والے دو گرجاگھر بھی ہیں۔ سیڑھیوں سے اُتر کر پائیں باغ کی طرف آتے ہیں یہ باغ واقعی جنّت نگاہ ہے۔ یہاں سمندر سے نکالی گئی نہروں کا ایک جال سا بچھا رکھا ہے۔ شالامار باغ کی طرح ایک طرف جھرنے سے پانی چمکتا ہوا بہتا ہے۔ باغ میں یونانی طرز کے سنہری مجسمے ہیں (ان کے اوپر سونے کا ورق ہے) جن کے دائیں بائیں دو بارہ دریاں ہیں۔ ان بارہ دریوں کی چھت سے بھی پانی کی آبشاریں مختلف تالابوں میں بہتی ہوئی باغ میں چلی جاتی ہیں۔ اس وسیع باغ کے وسط میں دو راستے ایک دُوسرے کے مقابل جاتے نظر آتے ہیں۔ ایک حصّہ باغ کو حضرت

آدم کا باغ اور دوسرے کو اماں حوّا کا باغ کہتے ہیں۔ ہماری ترجمان ہمیں حضرت آدم کے باغ کی طرف لے گئیں۔ (ویسے یہ آزادیٔ نسواں کا زمانہ ہے چاہیے تھا کہ اماں حوّا کی طرف رُخ کرتے) اس باغ کے وسط میں ایک "لنڈن ایوی نیو" ہے۔ یعنی روش پر دونوں طرف لنڈن کے درخت لگے ہیں۔ لنڈن کے یہ خوبصورت درخت برلن میں بہت پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے پھولوں کی چائے صحت کے لیے بہت مفید ہے۔

اس وسیع چمن سے گذر کر پیٹر اعظم نے بالٹک کے کنارے پر پکنک کے لیے اپنے لیے بنگلہ بنا رکھا تھا جس میں وہ اپنے خاص دوستوں کو مدعو کرتے تھے۔ یہاں پر پھل دار درختوں کے درمیان طرح طرح کے خوبصورت سنگِ مرمر کے فوّارے بنے ہوئے ہیں۔

پیٹر اعظم کی مزاح کی حس بھی بہت تیز تھی۔ سو یہ ایک دلچسپ قصّہ ہے۔ پیٹر اعظم کی محفل میں اس کے کورٹ کے اکثر امراء اپنی بیگمات کے ساتھ آتے تھے۔ بیگمات بہت نفیس اور قیمتی لباس پہنے، جڑاؤ جواہرات سے مزیّن ہو کر آتیں۔

کھانے کے بعد پیٹر اعظم انہیں اکثر کہتے کہ باہر جا کر کسی بنچ پر بیٹھیں یا روشوں پر چہل قدمی کریں۔ ان روشوں کے آس پاس گنجان پھولدار جھاڑیوں کے درمیان گھاس میں ایسے پُراسرار طریقے سے پتھر جمائے گئے ہیں کہ اگر کسی ایک پر پاؤں پڑ جائے تو پانی کا ایک فوارہ نیچے سے لپک کر آپ کو شرابور کر دیتا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ "ایک نازنین دیبا، اطلس اور کمخواب میں ملبوس سولہ سنگھار کیے۔ بالوں میں موتی پروئے نازک سی پنکھیا، پھول سے ہاتھ میں لیے، پاؤں میں مخملی جوتا پہنے اس بالٹک کے سرد پانی سے سر سے پاؤں تک بھیگ کر زبردستی مسکرا رہی ہے۔ یہ بھی ڈپلومیسی کا ایک رُخ ہی سمجھیے۔ یا پھر دربار کا ایک شوخ لطیفہ۔ چونکہ سعد کو میں نے اس خطرناک راستے کے بارے میں بتایا تھا اس لیے وہ وہاں سے پھلانگ کر بچ نکلا۔ مگر ریحانہ خوب بھیگی اور سعد نے خوب مذاق اُڑایا۔ ذرا آگے چلے تو ایک اور ایسا درخت ملا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ امیر حمزہ کی لکھی ہوئی داستان کے طلسمی باغ میں سے گزر رہے ہیں۔ بچپن میں اخبار "پھول" میں لکھی ہوئی حاتم طائی کی کہانی پڑھی

تھی اور ایسی دلچسپ تھی کہ بار بار پڑھی تھی۔ اس میں ایسی جادوگری کے قصے بہت عام تھے۔ ہم بالکل اسی انداز میں ایک طلسمی درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے جس سے پانی بارش کی طرح برس رہا تھا۔ ہمارے ساتھ چند اور سیاح بھی گزر رہے تھے۔ ایک بچّی کی غلطی یا شرارت سے پاؤں ایک خطرناک پتھر پر پڑ گیا۔ اس کی شرارت سے میں بھی پانی پانی ہونے لگی تھی۔ میری برساتی آڑے آئی ورنہ بالٹک کا پانی اتنا ٹھنڈا ہے کہ زکام ضرور ہو جاتا۔ اس دلچسپ محلّے کو دیکھ کر بھیگتے بھاگتے گھر پہنچے۔

آج پہلی ستمبر ہے اور رُوس کے تمام مدارس یکم ستمبر کو کھُلتے ہیں۔ ہوٹل کے ٹی وی پر ہم نے دیکھا کہ اس دن کی تقریبات کو نہایت اہمیت اور خصوصیت سے دکھایا جاتا ہے۔ پہلے دن ہر بچّہ پھولوں کا گلدستہ لے کر سکول جاتا ہے۔ اسکول میں اُستاد اور اُستانیاں ان کا یوں خیر مقدم کرتے ہیں جیسے وہ سچ مچ کے ہیرو ہیں اور سچ پوچھئے تو یہ ننھے منے ہیرو ہی ہر مُلک کے آئندہ معمار ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا کہ سوویٹ یونین میں بچّوں پر نہایت شفقت و محبّت سے توجہ دی جاتی ہے اور ان کی عمدہ تعلیم و تربیت کے لئے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ شیخ سعدیؒ نے مدتوں ہوئیں لکھا تھا کہ ؎

خشتِ اوّل گر نہد معمارِ کج
تا ثریا میرود دیوار کج

پہلی ستمبر کی رسم کو اس قدر فوقیت اور شان و شوکت سے منانے کا انداز مجھے تو بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ ٹی وی میں بچّوں کے پروگرام میں ہم نے دیکھا کہ ملک کے تمام مدرسوں میں یہ تقریب منائی جا رہی ہے۔ بچّے پھُول لئے رقص کرتے اور گیت گاتے جا رہے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم بھی اسکول کھُلنے کے پہلے دن کو اسی طرح کی ایک تقریب اور خصوصی دن کی طرح منائیں تاکہ چھوٹے بچّوں کو محسوس ہو کہ اپنے مُلک میں ان کا اپنا ایک مخصوص مُقام ہے۔ ازراہِ کرم کیا ہمارے خداوندانِ تعلیم اس پر کچھ توجّہ دیں گے؟ قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۷ء میں کہا کہ

"آج کے چھوٹے بچّے کل ہمارے مُلک کے محافظ و نگہبان ہوں گے"۔۔۔

۲ ستمبر

دوسرے دن صبح سب سے پہلے ہم لینن گراڈ شہر کی ڈپٹی میئر مادام الی سیوا سے ملنے کے لئے گئے۔ مادام الی سیوا گذشتہ سال بیگم بھٹو صاحبہ کی استقبالیہ کمیٹی کی چیئرمین تھیں اُنہوں نے بیگم بھٹو کا استقبال کیا تھا۔ وہ بیگم بھٹو کی بہت مدّاح ہیں۔ ان کا دفتر زار الیکس دوم کی بیٹی کا محل تھا جنگِ عظیم کی بمباری میں اس کا بھی اکثر حصّہ تباہ ہو گیا تھا لیکن اب اس کے تمام سنہری نقش و نگار اور دیواریں از سرِ نو مرمّت سے بحال کر دیئے گئے ہیں اور اس کے نقش و نگار پرانی آب و تاب کے ساتھ چمکتے نظر آتے ہیں یہاں جھاڑ، فانوس، قالین اور تصاویر سب کی سب جاذبِ نگاہ ہیں۔

ہم انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز دیکھنے گئے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر پروفیسر تیروسیم ہیں۔ وہ لینن گراڈ کی اورینٹل لائبریری میں ہمارے لئے خضرِ راہ ثابت ہوئے۔ یہ ترکی زبان کے بھی عالم ہیں۔ دیگر پروفیسر صاحبان سے بھی ہماری ملاقات ہوئی جو کہ چینی، عربی، فارسی، اُردو اور سنسکرت کے اپنی اپنی جگہ ماہر ہیں۔ اسی لئے سجاد صاحب نے عربی اور فارسی میں بھی شکریہ کا اظہار کیا۔ یہ لائبریری اس سے پہلے زار کا محل تھی۔ جھاڑ فانوس، قدِ آدم آئینوں تصویروں سے آراستہ و پیراستہ شاندار عمارت میں مشرقی زبانوں کی ساٹھ ہزار کتابوں کے نایاب مسودے موجود ہیں۔ دو منزلہ لائبریری میں تمام کتابوں کو نہایت اہتمام اور سلیقے سے الماریوں کے اندر سجا کر رکھا ہوا ہے۔

لائبریری میں دو گھنٹے کے قیام کے دوران میں ہم صرف مغل فنِ باریک ہی دیکھ پائے اس میں شہنشاہ بابر سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر اور مغل شہزادوں اور راجپوت سکول اور نایاب تصویریں مرقع کی صورت میں مجلّد ہیں۔ وہاں کی میزبان نگران نے صرف ہمارے لئے ان کو نکال کر ان کا ایک ایک ورق ہمیں دکھایا۔ واقعی یہ آرٹ کے لاثانی نمونے ہیں۔ بقول علامہ اقبال رح

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

یوں بھی اپنے ہاں کی چیزیں دیارِ غیر میں دیکھ کر فخر محسوس ہوتا ہے۔ اس بات سے زیادہ خوشی ہوئی کہ ریحانہ اور سعد بھی اپنے آباؤ اجداد کے تمدن اور تہذیب کی تاریخی

چیزوں کو دیکھ سکے۔ اس لائبریری کی نگہبان نے کہا کہ ہماری لائبریری کے لئے کچھ پاکستانی کتابیں دی جائیں۔ یہاں حسنِ اتفاق سے آج کل محترم ابنِ انشاء صاحب آئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے اس سلسلہ میں عرض کیا اور کہا کہ پاکستانی کتابیں اورینٹل لائبریری کے لئے ضرور مہیا کریں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ پاکستان جاکر ضرور کچھ کتابیں لائبریری کے لئے بھیجیں گے۔ خصوصاً اقبالیات۔

آج بارش یوں ہو رہی تھی جیسے سب مون سون یہاں ہی آگئی ہو۔ لائبریری سے نکل کر ہم بھیگتے بھاگتے ہرمی ٹیج محل پہنچے۔ لینن گراڈ کا اصلی دل یہی ہے۔ یہ شاندار محل ملکہ کیتھرائن دوم نے بنوایا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کی طرح اس نے اپنی زندگی کا آخری حصّہ اس گوشۂ عزلت میں گزارا۔ اس لئے اس کو ہرمی ٹیج کہتے ہیں۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ گوشۂ تنہائی ہرگز نہیں ہے۔ اس محل میں سینکڑوں دالان در دالان اور لاتعداد غلام گردش ہیں۔ ہم یہاں تین بجے دوپہر پہنچے۔ شام کے چھ بجے اس محل کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ یہاں ہر قسم کے نوادرات کا دریا ایک کوزے میں بند ہے۔ یہ محل دریا نیوا کے کنارے ایک پُر فضا مقام پر تعمیر ہے۔ مغلیہ محلّات کی طرح باہر کی طرف کوئی باغات، خوبصورت برج۔ خندق یا فصیل تو نظر نہیں آئی لیکن اس کے اندر دوسری منزل پر ایک خوبصورت باغ ضرور ہے۔ سعدؔ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ باغ اس قدر اوپر کس طرح بنایا گیا ہے؟

ملکہ کیتھرائن دوم کو پیٹر اعظم کی طرح مغربی یورپ کے آرٹ کے نمونوں کو جمع کرنے کا بے پایاں شوق تھا۔ اس لئے اس نے اپنے محل کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ اوّل حصّہ اس کی رہائش کے لئے تھا۔ دوم مہمان خانہ اور سوم عجائب گھر کے لئے مخصوص تھا۔ اس حصّہ محل میں عمدہ تصویریں، مجسمے، زیورات، قالین، طلائی و نقرئی برتن، فرنیچر۔ کتابیں اور دیگر عجوبۂ روزگار چیزیں جمع کر رکھی تھیں۔ ماسکو آنے سے پہلے جرمنی میں مجھے مغربی ممالک کی سفیروں کی بیگمات نے بتایا تھا کہ ہرمی ٹیج میں جس قدر آرٹ کے شاہکار ہیں ان کا عشرِ عشیر بھی فرانس انگلستان، اٹلی یا کسی اور مغربی ملک کے عجائب گھروں میں نہیں ہے۔ یہاں کی ایک ایک

چیز دیکھنی ہو تو کم از کم ایک مہینہ چاہیئے۔ ہمارے پاس چونکہ صرف تین گھنٹے کا وقت تھا اس لئے ہمارے گائیڈ نے جو کہ فارسی زبان کے ماہر بھی ہیں تجویز کیا کہ ہم ایران اور قدیم ہندوستان کا ایک حصہ پہلے دیکھ لیں اور پھر مغربی یورپ کی طرف جائیں گے۔ اس جگہ پر ہندوستان کے حصے میں کشمیر میں بنی ہوئی اخروٹ کی میز کرسیاں، کشمیری شالیں، جامہ دار دوشالے بنارس کی قدیم ساڑھیاں اور کشمیری چاندی کی منقش اور پیپر ماشی کے کام کی بنی ہوئی نازک چیزیں گلدان وغیرہ دیکھیں۔ یہاں پر سب سے نایاب چیز جو مجھے نظر آئی وہ ٹیپو سلطان کے گھوڑے کی تاریخی اور انمول رکاب تھی جو ہیرے اور جواہرات سے مزین تھی۔ قیمتی پتھروں سے جڑا ؤ رکاب اپنی جگہ خوبصورت تو ضرور تھی مگر میری نظر میں اس کا تاریخی مقام اور بلند ہے۔ حسن اتفاق سے میں اس کو بچوں کو بھی دکھا سکی۔ ٹیپو سلطان بچپن سے میرے ہیرو رہے ہیں۔ یہ وہ بہادر مردِ مومن ہے جسے اگر اس کے اپنے ہمسائے نظام اور مرہٹے وقت پر دھوکہ نہ دیتے تو مدتوں پہلے وہ ہمارے پیارے وطن سے انگریزوں کو نکال باہر کر دیتا۔

ہم نے پرانے شہر افراسیاب کی بھی تصویریں دیکھیں۔ یہ قدیم شہر سمرقند کے قریب تھا۔ اس کے بعد ہم سینکڑوں غلام گردشیں پھلانگتے اور بے شمار سیڑھیاں اترتے چڑھتے "کمرہ طلائی" میں پہنچے۔ اس میں سُنا ہے صرف خاص الخواص کی ہی رسائی ہو سکتی ہے اور اجازت سے ہمیں وزارتِ خارجہ کی مہربانی سے کمرہ طلائی دیکھنے کی اجازت ملی۔ میوزیم کا یہ حصہ جسے سنہرہ حصہ کہتے ہیں سیتھین تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں تمام سیتھین زمانے کے خالص زیورات موجود ہیں۔ اس میں سے اکثر زیور اب بھی ہمارے ہاں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے کانوں کے سونے کے مگر اور بالے۔ چندن ہار۔ چوڑیاں، گلوبند۔ بلدار کڑے، انگوٹھیاں۔
میری والدہ اور بڑی بہن کے بلدار کڑے اور گلوبند بالکل اسی قسم کے ہیں۔ اس کے ساتھ دوسرا کمرہ ہے جسے اصلی کمرہ کہئے۔ یہاں شیشے کے کئی نازک الماریاں، انمول جواہرات سے جھلمل جھلمل کرتی نظر آتی ہے۔ اس کمرے میں زارینہ ملکہ کیتھرائن کے ذاتی زیورات ہیں جن میں ان کے تاج، جواہرات جڑی گھڑیاں، نیلم۔ زمرد۔ الماس۔ یاقوت۔ زبرجد۔ ٹوپس

اصلی موتی، مونگے سے جڑے ہوئے بروچ، ہار، انگوٹھیاں، بالوں کی پنیں چند شوکیسوں میں نہایت قرینے سے رکھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح قیمتی زمرد اور الماس سے مرقع سنف باکسز بھی رکھے ہیں۔ (یہ اس زمانے کے رواج میں شامل تھے۔) مرصع پیٹیاں، فیروزہ و الماس جڑی چھڑیاں اور سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے جڑی تلواریں دیواروں پر لٹکی ہیں۔ ان میں اکثر ترکی سلاطین کے تحفے ہیں جو زار کو دیئے گئے تھے۔ قیمتی ہیرے اور سچے موتیوں کی بنی ہوئی بہت سی نازک چیزیں تھیں مثلاً ایک خوبصورت بطخ کا بروچ صرف ایک موتی سے بنا ہوا ہے ایک چھوٹا سا کتا، ایک چڑیا، چھوٹا سا خرگوش ایک دُرِ شہوار سے بنا طلائی زنجیر سے لٹکا ہوا ہے یہ محل ایک اطالوی معمار نے تعمیر کیا تھا اور اس کے طاق در طاق اور ستون در ستون فوارے اور مجسمے سب اطالوی حسنِ تعمیر کی غمازی کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہم محل کے دوسرے حصے کی طرف گئے جس میں نایاب اور قدیم تصاویر رکھی ہوئی ہیں۔ سجاد صاحب کو تصویریں دیکھنے کا بہت شوق تھا ہے۔ اس لئے پہلے ہم اس ہال میں گئے۔ جہاں تمام پرانے مصوروں کی تصویریں سجی ہیں۔ پھر محل کے اندرونی حصہ میں ملکہ کیتھرائن اور بادشاہ کی رہائشی جگہ دیکھی۔ یہاں پر سونے کا تخت، سونے کا ہی چھپر کھٹ میز و کرسیاں۔ سونے اور چاندی کے خوبصورت برتن بھی رکھے تھے۔

سعد اور ریحانہ کے اشتیاق کو دیکھ کر ہماری گائیڈ ہمیں بڑے دروازے کی طرف لے گئی۔ جس کو ۱۹۱۷ء میں انقلابیوں نے دھاوا بول کر توڑ دیا تھا وہ اسی دروازے سے محل میں داخل ہوئے تھے۔ اس وقت گویا لوگوں نے دروازے کو توڑ کر روس کی تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا ہے

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

شام کو ہم جدید بیلے دیکھنے کے لئے پشکن تھیٹر گئے۔ پشکن تھیٹر ماسکو کے بالشوائے تھیٹر کی طرح بڑا تو نہیں ہے لیکن یہ سنہری اور خوبصورت طرزِ تعمیر کا نمونہ ضرور ہے۔

۳ ستمبر

آج دریچہ سے صبح ہی صبح اُودے اُودے بادل نظر آئے اور چائے کے بعد

موسلا دھار بارش! اس روز ہم نے سب سے پہلے روسی عجائب گھر دیکھا۔ اس میں بہت سی مذہبی تصویریں رکھی ہیں۔ اس کے علاوہ روسی مصوروں کی واٹر کلر اور آئل کلر تصویریں ہم سینٹ آئی زک کا کیتھیڈرل دیکھنے گئے۔ اس کے گنبد پیازی نما نہیں ہیں بلکہ کلاسیکل قسم کے ہیں ـــــ یہ گرجا بھی اطالوی معمار کا بنایا ہوا ہے۔ اس کے اندر ثقل کا ایک پیمانہ بنا رکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین گول ہے اور ہر وقت حرکت کرتی ہے۔ سعد اور ریحانہ اسے دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ یہ پیمانہ ۱۹۲۰ء میں بنایا گیا تھا اور ان کی سائنس دانی کی دلیل ہے۔

آج رمضان المبارک کا پہلا جمعہ تھا۔ لہٰذا ہم امیر بخارا کی بنائی ہوئی شاندار اور خوبصورت مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے کے لیے گئے۔ ہم لوگ جمعہ کی نماز سے ذرا پہلے پہنچے۔ دروازے پر محترم امام صاحب نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ نئی خانم مجھے اور ریحانہ کو لے کر بالائی منزل پر لے گئیں۔ سجاد صاحب اور سعد مسجد میں امام صاحب کے ساتھ چلے گئے۔ اوپر کی منزل بہت خوبصورت تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم قاہرہ میں بیٹھے ہیں۔ لکڑی کی بہی باریک منقش جالیاں بہت نازک اور دلنواز معلوم ہو رہی تھیں جیسے کہ بغداد یا بخارا میں ہوں۔ مسجد میں خوبصورت قالین، جانمازیں اور ہر جانماز پر قاعدہ سے تسبیحیں رکھی ہوئی تھیں۔ اوپر کی منزل پر ۲۰۰، ۳۰۰ خواتین موجود تھیں۔ ان خواتین نے ہمیں گھیر لیا۔ سب نے ہم سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ السلام علیکم اور خوش آمدید کہا۔ یہ سب تاتار مسلمان تھیں۔ مسجد کے اندر ۵، ۶ سو مسلمان جمع تھے۔ محترم امام صاحب نے نماز اور خطبے سے پہلے سجاد صاحب کا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں جو کہ ہمارا عزیز اور دوست ملک ہے اور اسلامی مملکت ہے۔ انہوں نے پاکستان کے مسلمانوں کی بہت تعریف کی۔ سجاد صاحب نے بھی عربی میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں آج یہاں آپ لوگوں کے ساتھ اس خوبصورت اور تاریخی مسجد میں نماز جمعہ ادا کر رہا ہوں۔ امام صاحب نے خطبہ فصیح عربی میں پڑھا اس کا تاتاری زبان میں ترجمہ ہوتا گیا۔ تاتاری زبان میں آدھے الفاظ فارسی کے

ہیں۔ اس لئے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم لوگ کسی عجمی ملک میں یا اپنے عزیز ملک پاکستان میں ہی بیٹھے ہیں۔ واپسی پر خانم نے رانی اور سعدیہ کو دو عطر کی بوتلیں تحفتاً پیش کیں۔ گویا یہ رسم بھی اپنی ہی نظر آئی۔ واقعی رمضان شریف کے مہینے میں امیر بخارا کی بنائی ہوئی اس مسجد میں نماز جمعہ پڑھ کر بہت مسرت حاصل ہوئی۔ یہ خیال بار بار آیا کہ اقبال کس قدر اسلام کے عالمگیر رشتۂ اخوت کے پرستار تھے۔

ع   ما پرورده یک نو بہاریم

اسی شام کھانے کے بعد پشکن کے گاؤں گئے۔ وہ بھی ایک قصبہ ہے جو کہ لینن گراڈ سے ۶۰، ۷۰ میل دور فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں اس زمانے میں زار اور زارینہ کنٹری ہاؤس بنا کر رہا کرتے تھے۔ اس کو پہلے پار لا کہتے تھے لیکن اب اسے پشکن کا گاؤں کہتے ہیں۔ یہاں پشکن کا پرانا گھر ہے۔ پشکن رُوسی زبان کا بہت بڑا ادیب تھا۔ یہاں پر ملکہ کیتھرائن اور اس کے بیٹے پوآل کے موسم گرما کے محلات ہیں۔ پوآل کی بیوی جرمن شہزادی ماریا تھی جو کہ بہت خوبصورت تھی۔ شہزادی ماریا کا مذاق بھی بہت اونچا تھا۔ اس لئے اس کے محل میں بہت خوبصورت اور نازک آرٹ کی چیزیں جمع ہیں۔ محل میں جگہ جگہ اسی خوبصورت شہزادی کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ملکہ کیتھرائن کے موسم گرما کے محل کے اندر ایک خوبصورت چھوٹا سا چرچ بھی ہے جس کی نیلی دیواروں پر چاندی سے مرصع کاری کی ہوئی ہے۔ چاندی کے چوکھٹ جڑے آئینے بھلے لگتے ہیں۔ سُنا ہے کہ اس کے پاس ہی بچوں کا مدرسہ تھا۔ اسکول کے صرف ہونہار اور لائق بچے ہی یہاں آکر چرچ کی موسیقی میں شامل ہو سکتے تھے۔ رُوس کے عظیم ادیب پشکن کا گھر بھی اسی محل کے قریب ہے۔ باہر ایک پارک میں اس کا مجسمہ نصب ہے۔

واپسی پر رات کا کھانا کھانے کے لئے ہم باکو ریستوران گئے۔ یہ آذربائیجان کا ریستوران ہے۔ یہاں کھانا بالکل ہماری قسم کا ملتا ہے۔ شوربا پلاؤ اور سیخ کباب، بقول ریحانہ ان کا اندازِ گفتگو اور اخلاق بھی بالکل پاکستانی ہے۔ السلام وعلیکم کے بعد بار بار مرحبا

کہتے ہیں ۔یعنی خوش آمدید ۔ آذر بائیجان کے لوگ ایک مخصوص قسم کی ترکی بولتے ہیں جس میں تھوڑی سی فارسی کی بھی آمیزش ہے ۔اسی رات کھانے کے بعد ۱۲ بجے رات کی ٹرین سے واپس عازم ماسکو ہوئے ۔

O

مکتوب ماسکو

۱۱

منسک ــــ خیابانِ ارم

مَیں اور رانی گذشتہ ماہ منسک سے ہوتے ہوئے وارسا گئے تھے۔ منسک (MINSK) رُوسی جمہوریہ بیلے رُوسیا کا دارالحکومت ہے۔ یہ تجارت اور تہذیب کا مرکز ہے۔ اس کی آبادی دس لاکھ ہے۔

منسک کی تاریخ قدیم رُوس سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا ذکر ۱۰۶۷ء کی کتب سے ملتا ہے۔ یہ دریائے سوس لاچ کے کنارے واقع ہے اور اس تاریخی راستے پر واقع ہے جو بحرِ اسود سے بحیرہ بالٹک کو جاتا ہے۔ ۱۱ویں اور ۱۲ویں صدی کے دوران بیرونی حملہ آوروں سے اس کو بہت نقصان پہنچا۔

۱۹۱۷ء سے پہلے زارِ رُوس کے زمانے میں منسک ایک غیر معروف شہر تھا۔ لیکن انقلابِ اکتوبر کے بعد ۱۹۱۹ء میں اسے بیلے روسیا کا دارالحکومت بنایا گیا۔ اس وقت سے آج تک اس شہر نے ہر شعبہ میں ترقی کی ہے۔ دُوسری جنگِ عظیم میں نازیوں نے شہر بالکل تباہ کر دیا۔ ۱۹۴۵ء کے بعد منسک کے باشندوں نے سوویت یونین کے تمام عوام کی مدد سے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا اور پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور شاندار بنا دیا۔ اب اس کی کھلی کھلی سڑکیں، ہرے بھرے پارک اور بلند و بالا عمارات قابلِ دید ہیں۔ سب سے بڑی سڑک لینن ایونیو بہت خوبصورت ہے جس کے سرسبز درختوں کی اوٹ میں جدید عمارات ایستادہ ہیں۔

منسک سے کئی قسم کا سامان باہر کے ملکوں کو بر آمد کیا جاتا ہے جس میں موٹر سائیکل سائیکل، گھڑیاں، فریج۔ ٹی وی سیٹ، بھاری ٹرک، ٹریکٹر اور بسیں قابل ذکر ہیں۔

صنعت وحرفت کے علاوہ یہ شہر تعلیم کا مرکز بھی ہے۔ یہاں کی سائنس اکیڈمی میں بہت سی تحقیقات ہو رہی ہیں۔ یہاں پر ایسی تقریباً ۱۳ اعلی تعلیمی درس گاہیں ہیں۔ لینن اسٹیٹ یونیورسٹی اور کئی پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ہیں۔ ان کے علاوہ ۲۳ اسپیشل ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ہیں۔

منسک کے عجائب گھر بھی قابل دید ہیں۔ بہت سی نمائشی گیلریاں بھی ہیں جہاں بیلے روسیا کے کاریگروں کی بنائی ہوئی صنعتیں دکھائی گئی ہیں۔ یعقوب کولاس کے عجائب گھر میں بیلے رُوسی عوامی شاعروں کی شاعری سے متعارف ہوا جاسکتا ہے۔ شام کو جب تمام سڑکوں پر قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اور منسک کی سڑکیں جگ مگ جگ مگ کرنے کرنے لگتی ہیں تو تھیٹروں کے پردے بھی کھنچ جاتے ہیں۔ جن میں بالشوئے اپیرا، بیلے تھیٹر۔ بیلے رُوس اکیڈیمی تھیٹر، میکسم گورکی ڈرامہ تھیٹر، بچّوں کا تھیٹر، میوزیکل کامیڈی اور سرکس شامل ہیں۔ یہ سب کے سب تفریح کے نت نئے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ اسٹیٹ فوک آرکسٹرا اور اسٹیٹ فوک اکیڈیمی دونوں بہت مشہور ہیں۔ گویا ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

یہاں کا آرکسٹرا ہر سال تقریباً آٹھ ہزار کنسرٹ پیش کرتا ہے۔ منسک ہوٹل یہاں کے ہوٹلوں پر سبقت رکھتا ہے۔ ہوٹل بھلی اینیا بھی بہت مشہور ہے۔ اگر آپ موٹر میں سفر کر رہے ہوں تو شہر کے قریب ہی ہرے بھرے جنگلوں میں موٹر پارک کرنے کی جگہ بھی ہے۔ قریب ہی ایک خوش نما ہوٹل بنا ہوا ہے۔ گرمی و موسم بہار میں نہایت ہی حسین قیام گاہ ہے۔ ہر طرف پھول اور سبزہ ہے غالبؔ دیکھتے تو ضرور کہتے ع

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں

خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

منسک کے ریستوران مخصوص بیلے رُوسی اور عام یورپین کھانے پیش کرتے ہیں۔ یہاں کے خاص کھانوں میں آلو، مچھلی، گوشت، پیاز اور چند مخصوص بُوٹیوں سے مِلا کر ایک خاص شوربا بنایا جاتا ہے۔ پُوریوں جیسے پین کیک بھی کریم اور کیوی آر (مچھلی) کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ یہاں کے مشروم بھی بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ جو قریب کے جنگل میں کثرت سے ملتے ہیں۔ (رُوس کے لوگوں کی مخصوص تفریحات بھی مشروم چُننا بھی شامل ہے) شہر سے باہر جاؤ تو پکنک کرتے ہوئے سب چھوٹے بڑے ٹوکریوں میں مشروم اور جنگلی پھُول چُنتے نظر آتے ہیں۔ جن کو گلدستوں میں سجایا جاتا ہے۔

اگر آپ سجاوٹ کی چیزیں خریدنا چاہیں تو یہاں پر لکڑی، بید، شیشہ اور مٹی کی بنی ہوئی چیزیں کثرت سے ملتی ہیں۔ بیلے روس کی کڑھائی بھی بہت معروف ہے۔ یہاں ہاتھ کے کڑھے ہوئے میز پوش، پلنگ پوش، پردے، نیپکن، خواتین کے بلاؤز اور مردانہ قمیض بہت خوبصورت کشیدہ کاری میں ملتے ہیں۔ ان کی کشیدہ کاری ہماری بلوچی کڑھائی سے ملتی جلتی ہے اور رنگ آمیزی میں شوخی سندھی اور بربوہی کام سے۔ بچّوں کے کھلونے اور لکڑی کے ظروف بہت بنتے ہیں۔ شیشہ کے برتن، پیالیاں اور گلاس بھی تیار ہو کر دُوسرے ممالک کو برآمد ہوتے ہیں۔

یہاں کا ہر شخص کام میں مصروف اور مُلک کی ترقی کے لئے کوشاں و فرحاں نظر آتا ہے کہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

○

مکتوبِ ماسکو

۱۲

"پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن"

یکم مئی۔ سوویت یونین کے غریب مزدور اور کسان کی فتح کی سالگرہ کا دن ہے ماسکو کا تمام شہر سُرخ کارنیشن کے پھولوں اور سُرخ جھنڈوں سے لعل گوں ہے۔ حسنِ اتفاق سے مطلع بھی صاف اور نکھرا نکھرا ہے۔ دُھوپ کی شعاؤں سے چمکتی دمکتی ہوئی صبح گرم ہے۔ واضح رہے کہ یہ چمکیلی گرم صبح یکم مئی کے دن رُوسیوں کے لئے ایک نعمت ہے چونکہ ابھی گذشتہ ہفتہ ہی برف باری تھمی ہے اور یُوں معلوم ہو رہا ہے کہ اپنے یہاں کا (لاہور اور اسلام آباد) وسطِ فروری کا خوشگوار موسم ہے۔

خوش قسمتی سے آج کل ریحانہ ہمارے پاس ہے۔ سجاد اور مَیں اسے یکم مئی کی تقریب میں اپنے ساتھ لے گئے۔ رُوس کے وزارتِ خارجہ کے چیف آف پروٹوکول مسٹر نکی فوروف سے ہم نے ذکر کیا تھا تو انہوں نے بہت شوق سے ریحانہ کو بھی یہ تاریخی پریڈ دیکھنے کی دعوت دی۔ ریحانہ نے آج کے تہوار کی مناسبت سے سُرخ رنگ کی قمیض شلوار پہن رکھی تھی۔ اُنہوں نے اس پاکستانی پوشاک کو بہت سراہا۔ ریحانہ کی مبارکباد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میڈم نکی فوروف نے تقریب کی مناسبت سے ریحانہ کے سُرخ جوڑے کی تعریف کی۔

اس جشن کے لئے ماسکو شہر اور سوویت یونین کے تمام بڑے شہروں کو دُلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ سُرخ جھنڈوں کے عقب میں درختوں کی ہری ہری کونپلیں، کومل کومل

پتّے، بلّوریں برف کی دیوار کے پس منظر میں قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح خوبصورت نظر آتے ہیں، جیسے گُلِ لالہ کے ہار اور ہری ہری چوڑیاں پہنے لاکھوں ننّھی منّی پریاں جھُولا جھُول رہی ہوں ؎

جھولنا جھلا دو رے انبوا کی ڈال میں
پپیہا بولے، پی پی
انبوا کی ڈال میں

سرکاری عمارات، دکانیں، سب پر نیا رنگ، نیا رُوپ، سڑکوں کے کنارے لیمپوں کے ساتھ قمقموں کے درمیان کاغذی گُلِ لالہ لگائے ہوئے، یہ سُرخ پھُول بجلی کے کھمبوں کے ساتھ سجے ہوئے بہت بھلے معلوم ہوئے۔ جب ہم غلام حیدر اور منیر اختر کو شہر کی روشنی دکھانے لے گئے تو رات میں یہ چراغِ لالہ روشنی بکھیرتے ہوئے اور بھی دلفریب نظر آئے۔ یُوں بھی آج چودھویں کا چاند ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ماہِ کامل بھی اس عظیم مُلک کے جشن کی خوشیوں کو روشن کرنے لئے حسبِ فرمائش آیا ہے۔ علّامہ اقبالؒ نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ خلوصِ دل سے کی ہوئی محنت اور ریاضت کا پھل ضرور مِلتا ہے۔

ع افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب اوّل اُٹھتا ہے حجاب آخر

یوم مئی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے ہم ½۹ بجے گھر سے نکلے اور ریڈ سکوائر اپنے ٹھکانے پر تقریباً ساڑھے نو بجے پہنچ گئے۔ یہ تاریخی چوک کریملین میں واقع ہے۔ اب قدیم زارا اور زارینہ کے ان شاندار محلّات میں سوویت یونین کے دفاتر ہیں۔ ریڈ اسکوائر کے دائیں طرف سینٹ باسل ("ST-BASIL") کا قدیم گرجا گھر ہے۔ اس کے نو گنبد ہیں ان پر سبز، سُرخ اور نارنجی رنگ کی پچکاری بہت نفاست سے کی گئی ہے اور اُوپر سونے کے ڈلے کی طرح چمکتے ہوئے گنبد ہیں۔ سیاح انہی عبادت گاہوں کو اپنی کتابوں میں "پیاز نما گرجا گھر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میرے خیال میں (اور یعقوب بھائی بھی گزشتہ سال یہی کہتے تھے) کہ یہ دُور سے ہماری مساجد کی مانند نظر آتے ہیں۔ البتہ ان کے گنبد کے اُوپر

سونے کی صلیب نصب ہے۔ یہ گرجا گھر اتنا خوبصورت ہے اور اس کے رنگوں کا امتزاج اتنا دلکش ہے کہ بقول شاعر ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

ریحانہ کو یہ عمارت بہت ہی پسند ہے اور بقول اہلِ پنجاب کہ "اس کا جواب نہیں"
کریملین کے محل کی قدیم فصیلیں، گرجا گھر اور فصیل کیساتھ ساتھ فلک بوس مینار کسی الف لیلہ کے قصّہ کا پس منظر معلوم ہوتے ہیں۔ ان میناروں کے اوپر ایک ایک ستارہ بنا ہوا ہے۔ جن میں بقول ہمارے دفتر کی سیکرٹری مسز والیا کے اصلی یاقوت جڑے ہوئے ہیں۔ سُرخ جھنڈوں کے سائے میں یاقوت اور بھی فروزاں نظر آئے۔

کریملین محل کے درمیان ایک بہت بڑا کلیسا ہے۔ یہاں سب سے پہلے زار "ہیبت ناک آئیوان" اور اس کی ملکہ کی تاج پوشی ہوئی۔ یہ رُوس کا پہلا بادشاہ جس نے اپنا نام گرینڈ ڈیوک سے تبدیل کر کے زارِ رُوس رکھ لیا تھا۔

وہ دیکھیے، بچے، بوڑھے، جوان ہاتھوں میں سُرخ سُرخ پھُول لئے، اُجلے اُجلے کپڑے پہنے جوق در جوق لال چوک کی طرف جا رہے ہیں۔ چند کے ہاتھوں میں درختوں کی سرسبز ٹہنیاں ہیں اور بچوں کے پاس کاغذ کے رنگ برنگے پھُول اور غبارے ہیں۔ دراصل تو مئی کا آغاز ہے۔ مگر یہاں کے موسم کی مناسبت سے اصلی پھُول کہاں! پھُول کاغذی ہی سہی مگر ان رُوسی بچوں کے چہرے خوشی اور اشتیاق کے ملے جُلے جذبات سے اصلی پھُولوں کی طرح کھلے جا رہے ہیں اور بچے تو ملک و ملّت کے قیمتی خزانے ہوتے ہیں۔

لینن کے مزار کے بائیں طرف کے چبوترے پر "سفارتی نمائندے" یعنی ہم سے خاندو بنش براجمان ہیں اور دائیں طرف کے چبوترے پر اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر صاحبان وسط میں لینن کے مزار کی چھت پر جناب بریژنیف صاحب مع پولٹ بیورو کے ارکان کے کھڑے ہو کر عوام کی سلامی لیں گے لیجیئے وہ سامنے کریملین کے ٹاور پر ٹھیک دس کا گھنٹہ بجتے ہی جناب بریژنیف صاحب سیڑھیوں پر چڑھتے نظر آئے۔ پُورا میدان تالیوں کی

آواز سے گونج اٹھا۔ یوں موسیقی کی دھنوں کے ساتھ یہ تاریخی پریڈ ٹھیک دس بجے شروع ہوگئی۔ پریڈ میں سینکڑوں بچے بچیاں اور نوجوان شامل ہیں۔ اپنی اپنی قسم کی وردیاں پہنے، اپنے اپنے جھنڈے فخر سے اٹھائے ہوئے۔ مجھے تو چھوٹے چھوٹے بچوں کا ایک لوک رقص بہت پسند آیا۔ رنگ برنگے پیلے پیلے، نیلے نیلے، پھولے پھولے لہنگا نما اسکرٹ اور واسکٹ پہنے ہوئے یہ لڑکیاں ہمارے چبوترے سے گڑیاں نظر آئیں۔ پھر کئی سو لڑکیوں کی ایک ٹولی سرخ اور سفید دوپٹے ہاتھوں میں تھامے جن کو چشم زدن میں انہوں نے کمال چابک دستی سے گوندھ کر شامیانہ کی طرح اپنے اوپر تان لیا اور ان کے نیچے سے بہت بانکپن سے پریڈ کرتی ہوئیں چبوترے کے سامنے سے گزر گئیں۔ چند سو اور لڑکیاں سروں پر رنگ برنگ کے رومال باندھے ہاتھوں میں رنگ برنگے رومال لہراتی ہوئیں موسیقی کی دھن پر چھم چھم کرتیں ایک دلفریب انداز سے گزر گئیں۔

ایک سجی سجائی ٹرک میں بیٹھے ہوئے، سونے کے میڈل بہت شان سے زیب گلو کئے "اولمپک" میں جیتے ہوئے کھلاڑی بھی نظر آئے اسی طرح ہر انداز میں شہری اور عوامی رنگ لئے مختلف ٹولے سامنے سے گذرتے گئے۔ ٹرکوں پر اور پیدل بھی۔ ہلکے پھلکے سے جشن بہار کی طرح پھولوں سے کھیلتے اور پھول بکھیرتے ہوئے قومی بینڈ کے ساتھ ساتھ یہ پریڈ ساڑھے گیارہ بجے تک ہم نے بھی دیکھی۔ بہت سے دوستوں نے تصویریں بھی لیں۔ ہم جب گھر آئے تو ٹی وی میں بہت دیر تک یہ جلوس کریملین کے میدان میں اسی ذوق و شوق سے گذرتے نظر آئے۔ اسی جلسہ گاہ سے اپنی موٹر تک پیدل آتے ہوئے لال چوک سے گھوم کر کریملین کے پارک کے ساتھ کی پگڈنڈی سے موٹر تک آنا پڑتا ہے۔ منزل سے پہنچتے پہنچتے نگاہوں کے سامنے کئی دلچسپ جھلکیاں نظر آئیں مثلاً ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے روسی عوام ایسے خوش اور شادماں تھے گویا کہ کسی عید کے میلے میں جا رہے ہوں۔ کریملین کے سامنے کے پارک ایسی خوبصورتی سے بنائے گئے ہیں کہ دریائے ماسکوا کے کنارے یہ خطہ آنکھوں کے لئے جنت نگاہ ہے۔ سرسبز ٹہنیوں میں سے کوئی پھول آنکھ مچولی کھیلتا نظر آیا اور دھانی دھانی روشوں کو دیکھ کر حضرت امیر خسرو کا

کے یہ مادھر بول یاد آتے رہے۔ ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۰ء میں دہلی میں حیدر آباد دکن کے مشہور عزیز صاحب قوال گایا کرتے تھے ؎

پھول رہی سرسوں، سکھی رہی، پھول رہی سرسوں

پگڈنڈی کے برابر نرم نرم گھاس پر کبوتر اطمینان سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے اور بچے اپنے باپوں کے کندھوں پر بیٹھے ہوئے، غباروں کو اڑاتے، ہنستے ہوئے ملے۔ گویا کہ ایک زندہ قوم کی چند تابندہ جھلکیاں مشاہدہ میں آئیں۔

مغربی برلن میں جناب بریژنیف صاحب کو میں نے نصیبِ دشمناں ہمیشہ بیمار ہی پڑھا۔ مگر مجھے تو وہ گذشتہ کی طرح چاق و چوبند بچوں کی سلامی کا جواب ایک مخصوص شفیق مسکراہٹ سے دیتے نظر آئے۔

اسی شب بنگلہ دیش کے سفارتخانہ میں برما کے سفیر کے اعزاز میں عشائیہ تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی بنگلہ دیش کی عمارت اپنی سی لگی وہاں کے مکینوں نے اس قدر تپاک سے خیر مقدم کیا کہ یگانگت کا جذبہ دل کی گہرائیوں نے محسوس کیا۔ میرے نادان دل کو ایسے احساسات بہت قیمتی معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے بھی اسی ضدی دل نے بنگلہ دیش کو کبھی بھی غیریت سے نہیں پرکھا تھا نہ ہی اسے اجنبی دیش سمجھا تھا اسی لئے اپنے پرانے عزیز ہم وطنوں کو دوبارہ پاکر پھولا نہیں سماتا۔ اسی دعوت میں نیوزی لینڈ کے نئے سفیر نے اپنے اندازے کا انکشاف کیا کہ پریڈ میں دس لاکھ سے کہیں زیادہ لوگ شریک تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ انسانوں کا ایک سمندر تھا جو اپنے محبوب لیڈر لینن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ سے منہ اندھیرے ہی چل پڑا تھا۔ مگر یہ سمندر جوشیلی غضبناک لہریں لئے نہیں تھا بلکہ ہولے ہولے ہلکولے کھاتا ہوا پانی حریر و پرنیاں کی طرح۔ میرے نادان دل نے پھر انہیں رشک سے دیکھا کہ ایک ہم ہیں کہ اقبالؒ کا سال منا رہے ہیں مگر کس ستم ظریفی سے اقبالؒ نے کہا ؎

"ما پروردۂ از یک نو بہاریم"

مسلم نہ تورانی ہے، نہ عرب ہے، نہ افغان ہے اور نہ عجمی مگر ہم ابھی تک

پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان کی بندشوں سے آزاد نہ ہو پائے۔ قائد کا سال تو میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بہت اچھی طرح منایا گیا۔ نہ جانے اب ہمارے عقل و حواس کو کیا ہوا ہے؟ ہم اغیار کو تماشہ دکھانے کے لیے کیوں آمادۂ پیکار ہیں۔

دُور دیس میں رہ کر کس قدر وطن کی قدر آتی ہے۔ یہ وہی جان سکتے ہیں جو ہماری طرح بنجارے ہوں۔ کس قدر دل چاہتا ہے کہ ہم بھی زندہ قوموں کی طرح اپنے میں باوقار شعار پیدا کریں۔ عزّت سے زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھیں اور اپنے بچّوں کو وہ پاکیزہ تعمیری پُرامن راستہ بتائیں جو اقبالؒ نے سکھایا۔ جو قائدؒ نے بتایا۔ اور جو اسلام کا اصلی پیغام ہے کہ

اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی؟؟

○

مکتوب ماسکو

۱۳

بین الاقوامی فلمی میلہ

۷ جولائی کو کریملن پیلس میں عالمی فلمی میلے کا پرچم لہرایا گیا۔ گویا جشن کا رسمی افتتاح تھا۔ سجاد، رانی اور میں بھی شریک ہوئے۔ بالائی منزل پر ڈپلومیٹ اور دوسرے معزز روسی بیٹھے تھے۔ اور نچلی منزل تماشائیوں سے پُر تھی۔ ہال کے وسیع اسٹیج پر بین الاقوامی فلم ڈائریکٹر فلم پروڈیوسر اداکار خواتین و حضرات اور فلمی فوٹو گرافر اور مصور صاحبان سبک سی نیلے رنگ کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ آغاز ٹھیک ساڑھے چھ بجے ہوا پس منظر کے پردے پر کریملن پیلس کا عکس اتنا دلکش بنا تھا کہ انسان دیکھتا ہی رہے۔ وہی دریائے مسکوا کے کنارے گھمبیر درختوں کے جھنڈ میں محصور سنگین فصیل کے اندر محلات، وہی سنہری کلس اور قوس قزح کے رنگوں کے پیاز نما گنبد، اونچے میناروں پر دمکتے ہوئے یاقوتی ستارے معلوم ہوتا تھا کہ چلمن اٹھاؤ تو بس مجھ اپنے آپ کو کریملن کی دہلیز پر پاؤ۔

محفل کا آغاز سویت یونین کے قومی ترانے سے ہوا اور موسیقی کی دھن کے ساتھ عالمی فلمی پرچم لہرانے لگا۔ پھر میلے کے مرکزی سیکریٹریوں نے تمام پروگرام سامعین کے سامنے پیش کیا۔ باری باری تمام فلم ڈائریکٹر، پروڈیوسر اداکار خواتین و حضرات اور کیمرہ مین اسٹیج پر آئے۔ مائیکروفون پر روسی زبان میں ان کا تعارف ہوا۔ ہماری کرسیوں کے ساتھ جو کہ صوت لگے تھے۔ ان کے نمبر گھمانے سے انگریزی فرانسیسی،

جرمن، ہسپانوی اور اطالوی زبانوں میں ساتھ ترجمہ ہو رہا تھا۔ میں نے انگریزی ہی میں سارے پروگرام کا لطف اُٹھایا۔ ریحانہ چونکہ روسی سیکھ رہی ہیں۔ اس لیے برابر روسی زبان سمجھنے میں کوشاں رہی اور گھر آکر بہت فخر سے بتایا کہ ۲۰ فیصد تو روسی سمجھ میں آرہی تھی۔ اس سال یہاں ۹۱ ملکوں نے حصّہ لیا۔ تمام فلموں کو انعام کی خاطر جانچنے کی جیوری بنائی گئی تھی۔ اس میں مختلف ملکوں کے لوگ شامل تھے۔ سویت یونین کے مشہور اداکار سلمن گل کا نام (غالباً اصل نام سلیمان گل ہے) کانوں کو آشنا معلوم ہوئے پولینڈ کی ایک خاتون بھی جیوری کی ممبر تھی۔ ان کا تعارف جب ہوا تو تمام ہال تالیوں سے گونج گونج اُٹھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صنفِ نازک کی عزت اور قدر کی مٹتی ہوئی رسم اس "خلائی دور" میں بھی موجود ہے جسے انگریزی میں CHIVALRY کہا جاتا ہے

مقرر صاحب نے بتایا کہ اس سال مقابلے میں آئی ہوئی فلموں میں سے کچھ فلمیں شہر کے بڑے بڑے سینماؤں میں دکھائی جائیں گی۔ اور عمدہ فلموں پر جج صاحبان انعامات مقرر کریں گے۔ یہ عالمی جیوری بہترین ڈائریکٹر، بہترین پروڈیوسر، بہترین اداکار اور اداکارہ، بہترین کیمرہ مین، بہترین میوزک ڈائریکٹر، بہترین مصوّر اور بہترین اسکرپٹ رائٹر کو انعامات کا مستحق قرار دے گی۔ انعامات خوبصورت میڈل، پیالوں، اور قلمدان کی صورت میں ہیں۔ یہ میڈل اور پیالے سوویت یونین کی کسی قیمتی دھات میں ڈھلے اور قیمتی اور انمول جواہرات سے مزین ہوں گے۔ مثلاً جیڈ، عنبر، عقیق، یاقوت فیروزہ، اور کرسٹل وغیرہ۔ سوویت یونین میں بہت سے قیمتی اور نصف قیمتی پتھر پائے جاتے ہیں۔ یاد بخیر اس دفعہ کراچی میں فرحت بھائی جان نے کہا کہ اگر بدخشاں جاؤ تو یاقوت ضرور ڈھونڈنا لعلِ بدخشاں فارسی قصائد کے دیوانوں میں تو بہت ملے۔ اب بدخشاں جائیں تو انشاء اللہ اصل کا سراغ لگائیں۔ بات سے بات نکلتی ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ جب ہم قاہرہ میں تھے۔ تو سجاد صاحب یمن کے بھی پہلے سفیر مقرر ہوئے جب وہ اپنی سندِ سفارت پیش کرنے گئے تو میں نے ان سے اور ان کے سیکرٹری سے کہا کہ وہاں سے ذرا کچھ عقیق تو لانا جب انہوں نے یمن کے بازاروں کا ذکر کیا تو وہاں

پر بالکل لاعلمی کا اظہار ہوا۔ ممکن ہے ملکہ بلقیس کے زمانہ میں ہوتے ہوں۔

دوسرے ممالک کی فلمیں روسی لوگ بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔ گذشتہ ماہ جب ہم "امراؤ جان ادا" دیکھنے گئے تو تمام ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا جب تمام فلمی وفد اپنے اپنے ارکان کے ساتھ کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے اور اداکار خواتین کے رنگا رنگ لباس اور چمکتے دمکتے زیورات سے اسٹیج مزین ہو گئی۔ تو ۱۹۷۵ء کی طرح اس سال بھی اپنے وفد کو نہ پا کر بہت مایوسی ہوئی۔ ہمارا وفد افتتاحی تقریب کے لئے وقت پر نہ پہنچ سکا اور دلِ ناداں مچلتا ہی رہا۔ ہمارے نمائندے بھی ہوتے تو ہم ان کے لئے بھی بقول ہمارے ہونہار خالہ ماں منیر اختر کے اس قدر اشتیاق سے تالیاں بجاتے کہ ہاتھ دکھنے لگتے۔ جب جناب فیض احمد فیض صاحب سے آخر مارچ ماسکو میں ملاقات ہوئی یا بقول محترمہ شمیم اکرام الحق صاحبہ فیضیاب ہوئے تو انہوں نے بتایا تھا کہ ان کی فلم تیار ہے اور فلمی مقابلہ میں اسے شریک کریں گے اور دوسری فلمیں بھی فلمی وفد کے ساتھ آئیں گی۔ لیکن جناب فیض صاحب بھی تو آخر شاعر ٹھہرے ؎

تیرے وعدے پر جئے تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

فلمی نمائندوں کے مفصل تعارف کے بعد میزبان ملک کی ایک فلم دکھائی گئی۔ اس کا نام "امن کے سپاہی" تھا۔ اداکاری مصوری اور تاریخی نقطۂ نظر سے یہ بہت عمدہ فلم تھی اس کی کہانی دوسری جنگ عظیم کے دوران کی تھی۔ روس۔ جرمنی پولینڈ یوگوسلاویہ بلغاریہ لندن اور کینیڈا کے وہ تمام تاریخی مناظر جو اس جنگ میں نمایاں تھے، اس فلم میں دکھائے گئے ہیں۔ چرچل اسٹالن۔ روزویلٹ، ہٹلر، بلغاریہ کے زار تھالکوس کے روپ میں اداکار بہت حد تک اصل ہی معلوم ہوتے تھے۔ یوگوسلاویہ کے مردِ آہن ٹیٹو بقول آتش جوانی میں بہت ہی وجیہہ رہے ہوں گے۔

---

۸ جولائی سے ہوٹل "روسیا" کے مرکزی ہال میں ہر روز چار فلموں کی نمائش ہوتی ہے۔ یہ سب مقابلہ کی فلمیں ہیں۔ اسی طرح ماسکو کے پانچ چھ بڑے سینما گھروں میں مقابلہ کی دوسری فلمیں بھی دکھائی جا رہی ہیں۔ رانی اور میں نے ہوٹل روسیا میں ایک یوگوسلاوی فلم DREAMER دیکھی۔ بعد میں اس کو انعام بھی ملا۔ یہ اچھی مگر ذرا سست رفتار فلم تھی۔

غلام حیدر اور منیر کو میں نے مراکش کی عربی فلم کے ٹکٹ منگوا کر دیئے۔ غلام حیدر کچھ کچھ عربی سمجھ بھی لیتا ہے۔ مگر اسے جو چیز اس فلم میں پسند آئی وہ چہرہ پہ نقاب ڈالے عورتیں گویا سے

"دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا"

اتوار کو مژدہ ملا کہ ہمارا فلمی وفد پہنچ رہا ہے۔ چلیئے غنیمت ہے۔ البتہ یہ ملال ضرور ہے کہ افتتاحی رسم میں شریک ہوتے تو ہمارے ملک کی ناموری بروقت ہوتی۔ پیر کے روز ہمارے ہاں سوویت فارن آفس کے ملی، پلوف ملنے کے اعزاز میں لنچ تھا۔ منیر اختر جو باہر نکلے تو غالباً انہوں نے ہمارے فلمی وفد کو دفتر کی طرف آتے دیکھا۔ شام کے کھانے پر فلموں کا ذکر چلا تو میں نے بتایا کہ منیر مبارک ہو! ہمارا وفد پہنچ گیا۔ منیر صاحب کی خوشی اور استعجاب دیکھنے کے قابل تھا۔ ہاتھ سے پلیٹ گر کر ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ بہرحال اگر ٹوٹ بھی جاتی تو سے

شکستہ ہو تو عزیز تر ہے۔ نگاہ آئینہ ساز میں، کے مصداق وطن کی محبت کے جذبہ کی نظر ہوتی۔ فوراً کہنے لگا کہ مجھے شک گذرا تھا کہ یہ ہمارے ہی ستارے ہیں۔ میں تو دعوت کے کام میں ایسا مصروف تھا ورنہ دفتر کی دہلیز نہ چھوڑتا جب میں نے اس کو یقین دلایا کہ وہ ہمارے ہاں بھی آئیں گے تو اسے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

۱۲ جولائی کو رانی کی روسی استانی نے بتایا کہ "کاس ماس" سینما میں ایک پاکستانی فلم "اُف یہ بیویاں" دکھائی جا رہی ہے۔ اب ہمارے خانساماں کا زبردست کمنڑی پھر شروع ہوئی۔ "رانی بی بی! یہ تو بہت اچھی فلم ہے، اسلام آباد کے مناظر لاہور واپڈا کا دفتر اور نہ معلوم اسے وطن عزیز کا کیا کچھ یاد آگیا۔ اس لیے اسے لے ہی جانا پڑا حالانکہ

وہ یہاں آنے سے پہلے اسلام آباد میں یہ فلم دیکھ چکا تھا۔ مگر وہ قصہ ہے حاتم طائی کا۔ "ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی تمنا ہے"۔ ان کی نیک تمناؤں کے ساتھ میں نے اپنے دفتر کی تمام بیگمات کو فرداً فرداً ٹیلیفون پر یہ خوشخبری سنائی کہ دور دیس کے سب ہجاباسی اپنے فلمی ستارے دیکھنے کے لئے آجائیں۔

اس شام رم جھم ہو رہی تھی۔ سینما ہال میں وہاں کے منتظمین نے ہمارا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا۔ جناب عزیز احمد صاحب سیکرٹری فلمی وفد کا اسٹیج پر تعارف کرایا گیا۔ لیکن ندیم صاحب نیر سلطانہ، سلیمان صاحب اور ان کی بیگم اسی روز اپنے میزبانوں کی دعوت پر لینن گراڈ جا چکے ہیں۔ ہر فلمی وفد کو ماسکو کے مخصوص مقامات کے علاوہ، چند مشہور شہروں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ یہاں کا دستور رہے کہ ہر فلم کے شروع ہونے سے پہلے یہاں کی انتظامیہ کمیٹی کا کوئی ممبر فلم کے ہیرو، ہیروئن اور فلم پروڈیوسر، ڈائریکٹر وغیرہ کا اسٹیج پر تعارف کراتا ہے۔ ہم نے سوچا چلو افتتاحی رسم کی کمی یہیں پوری ہو جائے گی۔ مگر یہ بھی حسرت ہی رہی عزیز صاحب کو اسٹیج پر لایا گیا۔ تو ہال میں تماشائیوں نے پاکستان کے نام پر، فلم کے نام پر اور عزیز صاحب کے نام پر ایک بار، دو بار اور سہ بار زور دار تالیاں بجائیں۔ وفد کے ارکان بھی موجود ہوتے تو ظاہر ہے اور زیادہ جوش و خروش دکھایا جاتا۔

"اُف یہ بیویاں" مصوری اور اداکاری کے لحاظ سے اچھی فلم ہے۔ یہ میرا ناقدانہ نہیں بلکہ دوستانہ مشورہ ہے۔ کہ یہاں جو فلمیں بھیجی جائیں ایک تو ان میں گانے طویل نہ ہوں کیونکہ روسی زبان میں گانوں کا ترجمہ نہیں کیا جاتا اور تماشائی اکتا کر باہر چلے جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم جیسے غریب ملکوں کو باہر کی دنیا میں اپنا صحیح نقشہ پیش کرنا چاہیئے۔ کوئی دیہاتی سادہ سی کہانی ہو۔ کسی غریب کسان، مزدور، ماہی گیر اور شہر کے نچلے یا متوسط طبقہ کے متعلق، یہ اونچی اونچی حویلیاں بیرونی ساز و سامان سے بھرنیہ یہ قیمتی اور بھاری ساڑھیاں الماس اور یاقوت جڑے زیورات ہم جیسے غریب ملک کا صحیح تصور پیش

نہیں کرتے۔

گذشتہ سال تاشقند کے فلمی میلے میں ہماری فلم "اک گناہ اور سہی" دیکھنے کے بعد ایک اُزبک خاتون نے بیساختہ کہا کہ کیا آپ کے ملک میں سبھی خواتین ایسے ہی پرتکلف مکانوں میں رہتی ہیں۔ اور کیا ایسے ہی اطلس، دیبا اور سنجاب کے لباس پہنتی ہیں۔ ہمارے فلم پروڈیوسر اور ہدایت کاروں کو اپنی فلموں کو باہر بھیجتے ہوئے اس بات کا تو خاص خیال رکھنا چاہیئے فلم بھی آرٹ ہے۔ ہر آرٹ کو حقیقت کا آئینہ دار ہونا چاہیئے ماسکو میں اس بین الاقوامی فلمی میلہ کا مقصد امن اور دوستی کے لئے فلمیں بنانا ہے۔ فلم کے پردے کی وساطت سے مختلف ممالک کے عوام ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں اور آپس کے مسائل کو سمجھنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک تعمیری کوشش ہے۔

---

۱۵ جولائی۔ بارے آج فلمی وفد کے ارکان ہمارے ہاں ظہرانہ کے لئے تشریف لائے حُسنِ اتفاق سے آج ہی سجاد صاحب کی سالگرہ ہے۔ میں نے کہا چلو یہ بھی نیک شگون ہے کہ آپ کے ستارے کے ساتھ فلمی ستارے مل گئے۔ مبارک باشد۔

جناب ندیم کی فلم "چکوری" مدت ہوئی دیکھی تھی مجھے تو بہت پسند آئی۔ صاف ستھرا پس منظر اور سادگی اور بے ساختگی کا انداز مجھے بے حد اچھا لگا۔ محترمہ نیرّ سلطانہ کی اداکاری میں نے فلم "امراؤ جان ادا" میں پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ وہ فلم اس قدر عمدہ تھی کہ رشید بھائی جو بہت ہی کم فلمیں دیکھتے ہیں۔ دو سال ہوئے مجھے خود کراچی میں بہت اصرار سے وہ فلم دکھانے لے گئے۔ ایک تو اس کی کہانی ہی اردو ادب کا ایک کلاسیکی ناول ہے، پھر محترمہ نیرّ سلطانہ کی اداکاری سونے پہ سہاگہ، وہ ایک تخلیقی کردار نگار ہیں۔ سلیمان صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کی شخصیتوں سے بہت متاثر ہوئی۔ دونوں اس کم عمری میں منجھے ہوئے سلجھے ہوئے اور بے حد خلیق اور ملنسار فنکار ہیں۔ غرور ان میں نام کو نہیں۔ سلیمان صاحب موچی دروازہ کے رہنے والے ہیں۔ یعنی خالص "لاہوری" ہیں تاہم ان کی زبان میں دہلی کی چاشنی بہت واضح ہے۔ گویا جمنا اور راوی

کے سنگم سے ان دونوں تاریخی دریاروں کی روانی وراثت میں پائی ہے "اُف یہ بیویاں!" "انارکلی" اور "آئینہ" ان کی بنائی ہوئی فلمیں ہیں۔ سلیمان صاحب خود ڈائریکٹر اور ان کی بیگم پروڈیوسر ہیں۔ بیگم سلیمان دہلی کی ہیں۔ مگر نفیس سی قمیض اور شلوار میں ایک سبک اور البیلی سی لاہوری "کڑی" معلوم ہوتی ہیں۔

نیر سلطانہ صاحبہ سے یہ معلوم ہو کر بہت مسرت ہوئی کہ ان کا تعلق علی گڑھ سے ہے اس علی گڑھ سے جس کے لئے "آواز دوست" کے ممتاز مصنف نے لکھا ہے کہ "پاکستان کی داغ بیل تو اسی دن رکھ دی گئی جس روز سر سید کے دست مبارک سے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی گئی"۔ ان کی گفتار و رفتار کی متانت اور شائستگی، غرارہ قمیض کی ساخت اور دوپٹے کے پیچھے لگے پلو میں علی گڑھ کے قدیم تمدن کی جھلک بہت نمایاں نظر آئی۔

فلمی وفد کے سیکرٹری جناب عزیز احمد سے گذشتہ سال تاشقند میں بھی ملاقات ہوئی تھی۔ کھانے کے دوران میں سلیمان صاحب اور ندیم صاحب دونوں سے نئی فلموں کے بارے میں دلچسپ بحث رہی۔ میں ان دانشمند فنکاروں سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ ہمارے ممتاز فلمساز ہیں۔ اب اگر وہ عام سطح سے ابھر کر اور معمول سے ذرا ہٹ کر اپنے لئے فلموں کے میدان میں ایک نئی ڈگر بنائیں۔ تو کیا مضائقہ ہے۔ مثلاً روزمرہ زندگی کے متعلق کہانیاں فلمائیں۔ عام زندگی کی شب و روز کی الجھنیں سلجھائیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کی کہانیاں اعلیٰ طبقوں کے متعلق ہوں اور ان کی ہیروئن زہرہ جبیں ہو یا گاؤں کی دوشیزہ ہو تو بھاری میک اپ گوٹہ کناری لگی لنگیوں کے ساتھ گاؤں کے پنگھٹ پر رقص کناں نظر آئے یا پھر ہیرو اور ہیروئن شام کو کلب میں مغربی ڈانس میں مدہوش ہو جائیں۔

کیوں نہ اپنا موضوع سخن عام سطح سے کیا جائے۔ چونکہ میرے ناچیز خیال میں ہمارے غریب اور پسماندہ ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ کتابوں سے کہیں زیادہ بولتی ہوئی فلمیں عوام کے لئے اصلاح اور فلاح کا وسیلہ بن سکتی ہیں۔ اس طرح ہم فلموں کے سہارے معاشرت کی خرابیوں کو آہستہ آہستہ مٹانے

کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔

دنیا کے تمام ممالک میں ہر طبقے کے عوام کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ضرور ہوتا ہے اور وہ اس آئیڈیل سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ برطانیہ میں اس جمہوری دور میں بھی شاہی خاندان سے بے پایاں محبت اور عقیدت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح امریکہ میں ہالی وڈ کے اداکاروں کے ساتھ، اپنے ہاں بھی اداکاروں کے لئے بہت قدر اور چاہت پائی جاتی ہے۔ اس لئے ان کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات عوام کے لئے دلچسپ ضرور ہو گی۔

سلیمان صاحب اور ندیم صاحب یہ سب مانتے ہوئے کہنے لگے کہ کیا کیا جائے اگر ہماری فلموں میں ایک درجن گانے اور ناچ نہ ہوں تو فیل ہو جاتی ہیں۔ عوام کہتے ہیں کہ اگر زندگی روکھی پھیکی ہے تو فلموں میں تو کچھ کچھ رنگینی اور چاشنی ہونی چاہیئے۔ گویا یہ تو فرار کا راستہ ہوا۔ بہر حال ہماری فلموں کا معیار پہلے کی نسبت اب ماشاء اللہ اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ اگر قابل ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور اسکرپٹ رائٹر اور اداکار ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ تو یقیناً ایک دن اپنی منزل کو پالیں گے۔ اس بات سے ہمیں فخر اور خوشی ہوئی کہ ہمارے فلمی وفد نے اپنے مختصر قیام کے دوران نہایت صلاحیت اور وقار سے ملک کی نمائندگی کی اور ہوٹل "روسیا" میں سینکڑوں سیاحوں مرد عورتوں اور بچوں نے ان سے بار بار آٹو گراف اور ان کے ساتھ درجنوں تصاویر اتروائیں۔

گذشتہ سال تاشقند میں بین الاقوامی فلمی میلہ کے موقع پر بھی محمد علی صاحب اور دوسرے فنکاروں سے بھی میں نے یہی گذارش کی تھی کہ آپ لوگ فلمی دنیا میں انقلاب لائیں اور اپنے ہاں کی فلموں کو حقیقت کا آئینہ دار بنائیں۔ مجھے امید ہے کہ تاشقند اور ماسکو میں دلیس دلیس کے فنکاروں اور فلم سازوں کے ساتھ تبادلہ خیال کر کے وہ نیا مشاہدہ اور تجربہ ضرور ساتھ لے گئے ہوں گے۔

---

۱۶ جولائی۔ آج سعد میاں خیر سے چھٹیوں میں گھر آیا ہے۔ آج رانی اور میں نے

سلیمان صاحب اور ندیم صاحب کی دعوت پر انٹرنیشنل فلمی میلہ کے مقابلہ کی ایک اُردو فلم دیکھی جس میں میری ایک پرانی کالج کی عزیز دوست تیجی کا بیٹا بھی کام کرتا ہے جب ہم ۱۹۵۷ء میں دہلی دوسری بار گئے تو تیجی اور ڈاکٹر بچن کے دونوں بیٹے نینی تال کے پبلک اسکول میں پڑھتے تھے۔ اس فلم میں شبانہ اعظمی بھی کام کرتی ہے۔ یادوں کے جھروکوں سے جھانک کر دیکھا تو اپنے ہاں کی دہلی کی ادبی محفلیں سامنے آگئیں جن میں گاہے گاہے۔ کیفی اعظمی صاحب بمبئی سے آکر شرکت کیا کرتے تھے۔ جدید اردو شاعری کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔

---

۲۰ جولائی۔ صبح دس بجے ندیم صاحب نے فلم "آئینہ" دیکھنے کے لئے اس قدر اصرار سے کہا کہ "بنا جائے نہ بنی"۔ بقول اقبال صاحب ہماری دفتر کی بیگمات تو فلمی وفد کی خواتین سے ملنے کے لئے بہت بیتاب ہیں۔ سب تو اپرات چھوڑ کر سینما ہال میں پہنچ گئیں۔ مگر صنف نازک پر یہ الزام اقبال صاحب کی سراسر زیادتی ہے۔ چونکہ وہ خود بھی اپنے ستاروں سے باتیں کرتے ہوئے بہت شگفتہ اور مسرور نظر آرہے تھے۔

۲۰ جولائی کی شام کو ہم نے فلمی وفد اور ان کے روسی عالمی فلمی میلہ کی کمیٹی کے میزبانوں کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ رانی بیگم کو آج بیگم سلیمان کا کمخواب کا لہنگا بہت پسند آیا اور نیر سلطانہ صاحبہ کی تاروں بھری ساڑھی بھی رشک قمر تھی۔ احتشام صاحب سے دوبارہ مل کر بہت خوشی ہوئی آپ اس قابل احترام خاندان کے چشم و چراغ ہیں، جس نے ڈھاکہ میں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔ کہنے لگے "بھائی خدا کا شکر ہے کہ اب وہ غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں اور ہم ایک دوسرے کے دوبارہ قریب آگئے ہیں۔

"میں نے جواب دیا لیکن کتنا کچھ کھو کر"۔

قہوہ کے دوران ایک دلچسپ انکشاف ہوا کہ کل ۱۹ جولائی کو ندیم صاحب کی سالگرہ تھی۔ میں نے کہا بتایا ہوتا ہمارے غلام حیدر صاحب سالگرہ کا کیک بنانے میں بہت ماہر ہیں تاہم رانی نے اپنے پیانو پر بعد از سالگرہ "ہیپی برتھ ڈے"، کی دُھن تو بجا ہی دی

۲۱ جولائی۔ آج عالمی فلمی میلہ کا اختتامی جلسہ ہوٹل "روسیا" کے درمیانی ہال میں تھا۔ ہم پونے چھ بجے وہاں پہنچے اور نیچے غلام گردش میں سب سے پہلے اپنے معزز وفد سے ملے۔ محترمہ نیر سلطانہ صاحبہ آج سیاہ ریشمی لاچہ اور کرتے کے ساتھ کارچوبی آب رواں کا دوپٹہ پہنے سچ مچ اندھیری رات میں "ستارہ" معلوم ہو رہی تھیں۔ یا جیسے کالی کالی بدلیوں کے چلمن سے جھانکتی ہوئی کوئی دلنواز سی کرن۔ ادھر چمپا اور کرن ٹکے سنہری چنے ہوئے دوپٹہ اور سنہری غرارہ قمیض کے ساتھ نازک سی مسز سلیمان کے کانوں کے ٹمٹاتے ہوئے آویزے مجھے "نقشِ فریادی" سے اپنا ایک بیحد پسندیدہ شعر یاد دلانے لگے

جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹاتا ہے وُہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

بڑے دروازہ سے اندر جاتے ہوئے روسی وزارت خارجہ کے افسر استقبالیہ سے ملاقات ہوئی۔ وُہ ہمارے فلمی وفد کو بٹھانے کے لئے ان کو مخصوص نشستوں کی طرف لے گئے۔ رانی سجاد اور میں سیڑھیوں سے اوپر جاکر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آج بھی اسی اہتمام سے جلسہ کی کارروائی ہوئی جس طرح افتتاحی جلسے کی ہوئی تھی۔ انعام پانے والوں میں ایک اطالوی فلم کو پہلا انعام "سونے کا میڈل" دیا گیا۔ چمکتے ہوئے انعامات اسٹیج پر میزوں پر سجے ہوئے رکھے تھے۔ اور دو حسینائیں انعام پانے والوں کو تالیوں کی تھاپ کے ساتھ ان کے ہاتھوں میں ایک انداز دلربائی سے انعام تھماتی جاتی تھیں۔ ایک خاص انعام ترکیہ کی فلم کے لئے تھا ایران کی ایک پیاری سی نوخیز ادا کارہ بھی اسٹیج پر انعام لینے آئی۔ ترکیہ اور ایران کے لئے ہم نے بہت تالیاں بجائیں۔ اور سجاد نے تو جاپانی فلم کے لئے بھی دہ یوں کہ وُہ جاپانی زبان کے محرم راز ہیں۔ اور یوں بھی کہ یہاں جاپان کے سفیر صاحب اور ان کی اہلیہ سے ہماری بہت دوستی ہے۔

بقول میری عزیزہ بہن زبیدہ فواد کے "انعام و اکرام" بانٹنے کے بعد اطالوی فلم دکھائی گئی۔ ہمارے ہاں چونکہ اسی رات کھانے پر مہمان آ رہے تھے۔ ہم دوسرے وقفہ کے بعد گھر

آ گئیں۔ میں عجلت میں اپنے وفد سے بھی ملاقات نہ کر پائی۔ سجاد تو پہلے وقفہ میں ہی ان سے مل آئے تھے۔ اسی لئے ۲۲ر جولائی کی صبح رانی اپنے ان فلمی معزز مہمانوں کو میری طرف سے خدا حافظ کہنے کے لئے ایئرپورٹ گئیں اور ان کے لئے اپنے گلدان سے چند پھول بھی لیتی گئیں اور میری طرف سے نیک تمناؤں کا سندیسہ۔

مجھے اُمید تو ہے کہ ہمارے سب پڑھے لکھے فنکار جو اپنے ملک سے دلی محبت رکھتے ہیں عزیز وطن میں اپنی شمعِ دانش سے جہل اور لاعلمی کی تاریکیاں دور کریں گے۔ ان سب کی مبارک کوشش پاکستان کی فلمی صنعت میں نشاۃ ثانیہ کی محرک ثابت ہو گی۔ یہاں مجھے مخدوم کا ایک پیارا سا شعر بے اختیار یاد آنے لگا ؎

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا
جانبِ مشرق اجالا سا نظر آنے لگا

O

مکتوب ماسکو

۱۴

ستاروں پر کمندیں؟

آج سات نومبر ہے اور سوویت یونین کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انقلاب رُوس کی ساٹھویں سالگرہ ہے۔ یوں تو ماسکو کا شہر اس تاریخی موقع کے لئے مہینوں پہلے سے ہی سج رہا تھا۔ تمام مشہور عمارات پر نئے رنگ و روغن، شاہراہوں کی زیبائش و آرائش اور سب سے بڑھ کر کریملین کے قدیم محلّات کی سجاوٹ۔ کریملین کے کلیساؤں کی سنہری گنبد سونے کے ڈلے کی طرح جگمگ جگمگ کرتے۔ دریائے ماسکوا کے پانی میں (جو ابھی برف آب نہیں ہوا) اپنا سنہری عکس ڈالتے بہت بھلے لگتے ہیں۔

آج صبح پریڈ کا وقت دس بجے تھا۔ یہاں برف باری پرسوں سے شروع ہوئی رات بھر برف گری مگر صبح رُک گئی، عزیزہ ریحانہ، سجّاد صاحب کے ساتھ جانے کے لئے صبح سے اوورکوٹ، دستانے، مفلر اور برف کے جُوتے پہن کر تیار تھی۔ یہ دونوں ساڑھے نو بجے (ریڈ سکوئر) لال چوک پہنچ گئے۔ جناب برزنیف صاحب اور کمیٹی کے دُوسرے معزز ارکان دس بجنے میں پورے پانچ منٹ قبل ہی لال چوک میں لینن کے مزار کی چھت پر پہنچ گئے اور وہاں سے انہوں نے فوجی پریڈ کی سلامی لی۔ یہ شاندار پریڈ کوئی ایک بجے تک جاری رہی اور بقول ریحانہ برف پوش زمین پر سُرخ سُرخ جھنڈے خوب بہار دکھا رہے تھے۔ ہر طرف بام و در پہ سُرخ جھنڈے اور تماشائیوں کے ہاتھ میں کاغذی سُرخ سُرخ پھول گویا ع

"پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن"

ماسکو شہر کے گیریسن کمانڈر فوجی پریڈ کا آغاز کرتے ہیں اور پھر فوجی بینڈ کیساتھ مختلف دستے حرکت میں آتے ہیں۔ قطار اندر قطار۔ خیر میں تو آرام سے ٹی وی پہ ہی دیکھتی رہی۔ یوں ہماری سڑک پہ بھی بہت چہل پہل تھی۔ اور باوجود اس قدر سردی کے عورت، مرد، بچے، بوڑھے، جوان فروسنجاب میں ملبوس تازہ و شگفتہ۔ خوش و خرم ادھر سے ادھر سیر کر رہے تھے۔ پیارے پیارے بچوں نے اونی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ سرخ، جامنی نیلی اور زرد اور ہاتھوں میں اسی طرح رنگ برنگ کے غبارے پکڑے ہوئے۔ اکثر تو آئس کریم بھی نوش جان کر رہے تھے۔ جب فوجی گاڑیاں۔ ٹینک اور راکٹ وغیرہ لال چوک سے ہو کر ہماری سڑک سے گزرے تو اس طرح میں نے دریچہ سے ہی کافی نظارہ کر لیا۔ یہ اور بات ہے کہ لال چوک کا منظر بہت شاندار رہے۔ دو بجے دوپہر کو کریملین پیلیس میں دعوت تھی۔ سب ڈپلومیٹس مدعو تھے وہاں جناب بریژنیف صاحب اور پولٹ بیورو کے ممبران میزبان تھے۔ وہیں جناب فیض احمد فیضؔ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سجاد صاحب کو بتایا کہ وہ کل ہی شام کو پاکستان سے آئے ہیں۔ اس دعوت کا انتظام بہت عمدہ تھا یوں بھی یہ محل ہلکی ہلکی دھند اور بلور جیسی صاف شفاف برف کے درمیان گھرا ہوا گویا پریوں کا محل معلوم ہوتا ہے۔ بجلی کے قمقموں کا قطار اندر قطار ہجوم اور شیشے کی دیواروں سے باہر ہر طرف سنہری گنبد اور محل کے اونچے اونچے میناروں پر جڑے یاقوتی ستارے دمکتے نظر آتے ہیں۔ سرخ جھنڈوں کے عقب میں گویا برف میں آگ لگی ہو یا پھر آپ اسے آتشی بلوریں کہئے۔

آج رات کو آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک آتش بازی کا تماشہ دیکھا مہتابیوں سے آسمان کبھی سرخ کبھی سفید اور کبھی نیلگوں اور کبھی زعفرانی ہو جاتا۔ اور کبھی کالی کالی بدلیوں میں ستارے چمکنے لگتے۔ ایسی ہی جفاکش قومیں اپنے عزمِ صادق سے ستاروں پر کمندیں ڈال لیتی ہیں۔

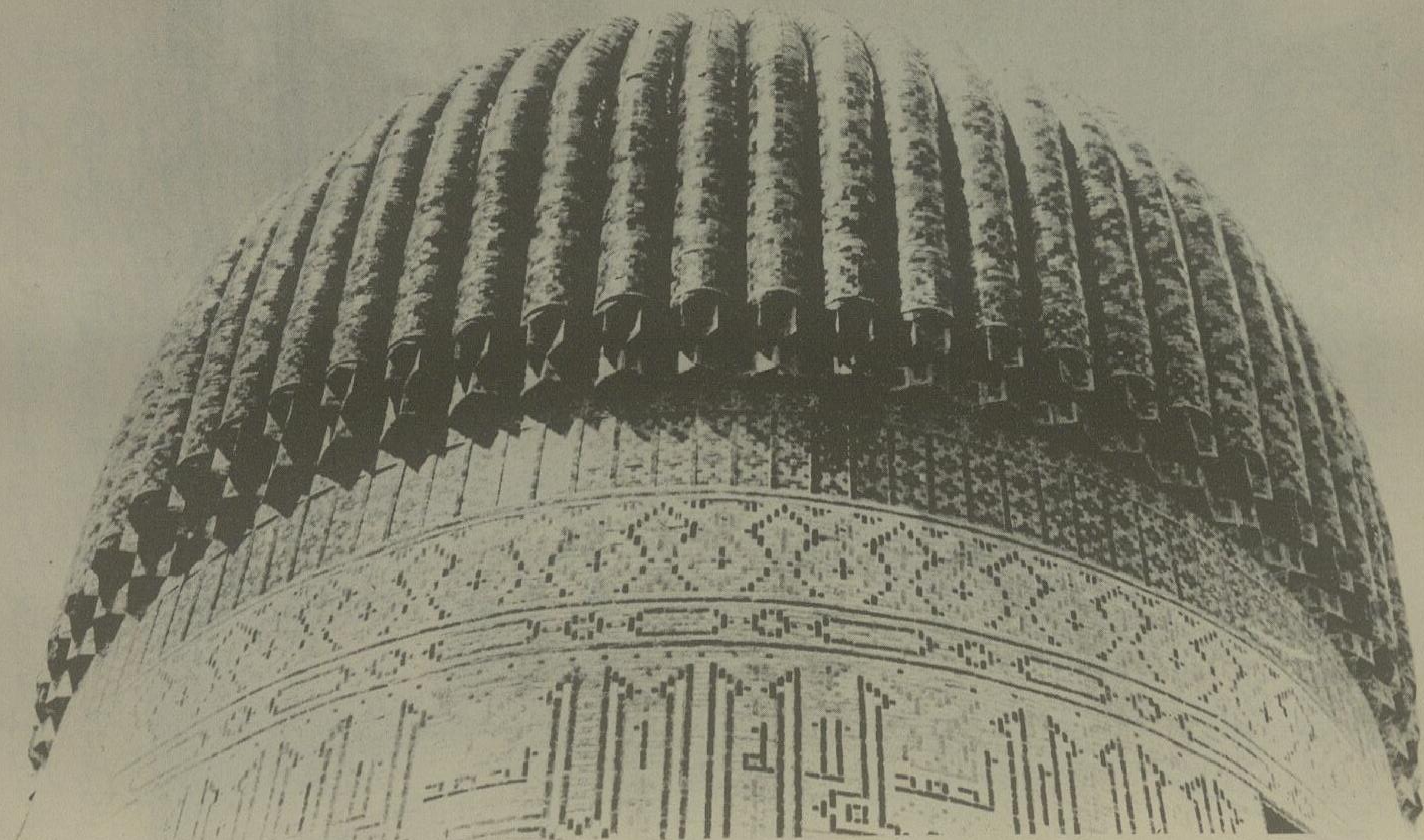
مکتوب ماسکو

۱۰۵

تاجکستان میں جشنِ اقبالؒ

آپ سے شرفِ ملاقات کے بعد ۱۹ر اکتوبر کی صبح کو چھ بجے میں اور ریحانہ بخیریت ماسکو پہنچے۔ ائرپورٹ سے گھر آتے ہوئے راستہ میں سجاد صاحب نے ذکر کیا کہ ۲۰ر اکتوبر کو میں جشنِ اقبالؒ کے سلسلہ میں دوشنبہ کو جا رہا ہوں۔ سجاد صاحب کا وعدہ تھا کہ جشنِ اقبالؒ کے سلسلہ میں مجھے تاجکستان ضرور لے جائیں گے۔ لیکن چونکہ میرے پاکستان سے واپس آنے کے دو دن بعد جشنِ اقبالؒ کا پروگرام تھا لہٰذا انہوں نے سوچا کہ میں تھکی ہوئی ہوں گی اور پھر اس قدر جلد اتنا لمبا سفر کرنا مشکل ہو گا۔ لہٰذا انہوں نے میرے جانے کا بندوبست نہیں کیا تھا۔ لیکن میں نے زندگی میں پہلی بار تریاہٹ کی۔ اور جشنِ اقبالؒ میں شامل ہونے کے لئے سجاد صاحب کو راضی کیا۔ میرے ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لئے اُسی روز نہایت دَوڑ دھوپ کر کے انتظام کر ہی لیا۔ میرے بے پناہ شوق اور علامہ اقبالؒ سے لگن کی بنا پر یہ مشکل کام بہ حسن وخوبی انجام پا یا۔ ورنہ اس قدر کم وقت میں یہ سارا انتظام ہونا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

۲۰ر اکتوبر کی صبح ساڑھے نو بجے ہم دمادیدوا ایرپورٹ سے دوشنبہ کے لئے روانہ ہوئے۔ دوشنبہ اور ماسکو کے وقت میں تین گھنٹہ کا فرق ہے۔ دوشنبہ جاتے ہوئے مجھے عالیجناب بابا جان غفور ؒ بہت یاد آئے۔ دو سال ہوئے جب ہم نئے نئے ماسکو آئے تو حضرت امیر خسروؒ کا ہزار سالہ جشن منایا گیا تھا۔ اس



سمرقند میں گور امیر کا تاریخی مقبرہ



بخارا میں اسماعیل سامانی کا مقبرہ

سلسلہ میں بابا جان غفوروف سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ میرا تب بھی جشنِ امیر خسروؒ میں شرکت کا ارادہ تھا مگر باوجود بابا جان غفوروف کی کوشش کے ٹکٹ نہ مل سکا کیونکہ ہمیں بلاوا صرف دو دن پہلے ملا تھا۔ بابا جان پاکستان کے بہت مہربان دوست تھے علامہ اقبالؒ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔

دوشنبہ کے وقت کے مطابق ہم شام چھ بجے وہاں پہنچے۔ ماسکو سے چلتے وقت اس قدر سردی تھی کہ برفیلی ہوا فر کے کوٹ کے بھی آر پار ہو رہی تھی۔ لیکن وہاں پر نرم و گرم چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور موسم نہایت خوشگوار تھا جیسا کہ لاہور میں شروع دسمبر یا اسلام آباد میں نومبر کے آخر میں۔

ایرپورٹ پر جشنِ اقبالؒ کے چیئرمین آغائے ایشمی اور استقبالیہ کمیٹی کے چند اصحاب خیر مقدم کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ کر فارسی زبان کی شیرینی نے راستہ کی تمام تھکن دور کر دی۔ ہمارے گائیڈ کا نام آغا مرادوف یعنی مُراد تھا وہ راستہ میں ہمیں شہر کے جغرافیہ سے آگاہ کرتے رہے۔ آج کا دوشنبہ جدید شہر ہے۔ قدیم شہر نسبتاً چھوٹا تھا اور کئی سال ہوئے زلزلہ سے تباہ ہو گیا تھا۔ نیا شہر خوبصورت اور جدید طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ کھلی کھلی سڑکیں۔ دو رویہ چنار کے درخت خوبصورت کشادہ مکانات سرکاری عمارتیں، دوکانیں، ہوٹل، چائے خانے باغات دائیں بائیں نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم اپنی جائے رہائش پہنچے۔ یہ سرکاری مہمان خانہ تھا۔ جو ایک وسیع صحن چمن تھا۔ یوں تو سجاد صاحب کے لئے شہر کے ہوٹل میں کمرہ مخصوص تھا۔ لیکن عین وقت پر میرے بھی ساتھ آنے کی اطلاع ملی تو جشنِ اقبالؒ کی انتظامیہ نے کمال مہربانی سے ہمیں سرکاری مہمان خانہ میں ٹھہرا دیا جہاں "ایشیا کی تہذیب" کی کانفرنس کے نمائندے ٹھہرے ہوئے تھے۔ سرکاری مہمان خانہ کے چمن کو دیکھ کر مجھے بچپن میں کوئٹہ کے پاس ایک سرسبز جگہ "ہنّہ" یاد آگئی۔ وہاں ایک دفعہ میں اپنے والد کے ساتھ گئی تھی۔ یہ چمن زار بھی بالکل ویسا ہی نظر آیا۔ ایسی ہی گھنی بیچ در بیچ انگور کی بیلیں، قطار در قطار ناشپاتی، سیب، شفتالو، آلوچے اور انار کے درختوں

سے مزین اور باغ کے درمیان چھوٹی چھوٹی روشیں سیر کے لئے بنی ہوئی تھیں۔ رہائش گاہ میں سونے اور بیٹھنے کے کمرے آرام دہ تھے، عمارت کے قریب ہی پھل دار درختوں کی پگڈنڈی ہے جہاں طعام کا کمرہ تھا۔ اس کے چاروں طرف انگور کی بیلوں سے گھرے ہوئے لکڑی کے برآمدے تھے اور اندر ایک وسیع دالان اور اس کے ساتھ باورچی خانہ تھا۔ اسی دالان میں سب مہمان صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور رات کا عشائیہ تناول کرتے تھے، کھانے کے دوران مختلف ممالک کے افراد سے ملاقات ہوتی اور معلومات میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہ اپنی جگہ ایک دلچسپی کا سامان تھا۔ ہر دستر خوان پر تر و تازہ انگور، سیب تربوز کے ساتھ ساتھ نرم و گرم نان اور انگور و کشمش کا مربّہ نظر آیا۔ فارسی زبان سے یوں بھی ہم پاکستانیوں کو محبّت دیرینہ ہے۔ لیکن اس انگوروں سے لدی ہوئی فضا میں اگر تو یوں معلوم ہوا کہ سچ مچ عمر خیام اور حافظ شیرازی کی دنیا میں آگئے ہیں اور جیسا کہ خواب کبھی کبھی سچ بھی ہو جایا کرتے ہیں بچپن سے جس شہر اور جس وادی کو دیکھنے کی تمنّا تھی اُسے دیکھ کر بھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ حقیقت نہ ہو۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ تہذیب، تمدّن اور مذہب اور زبان کے ناتے سے تاجکستانی ہم سے بہت قریب ہیں۔ تاجکستان کو "کوہ ہائے بلند" اور "وادی ہائے زرنگار" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کا حدود اربعہ یوں ہے۔ شمال اور مغرب میں ازبکستان اور قرغزستان۔ جنوب میں افغانستان اور مشرق میں چین اور افغانستان کو پار کر کے پاکستان۔ جو ان کا نزدیکی عزیز ہمسایہ ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ کوہ ہندوکش، جنوب مشرقی تاجکستان کو پاکستان سے جدا کرتا ہے۔ اس علاقہ میں کوہ ہائے باحشمت اور وسیع زرافشاں دریا موجود ہیں۔ تاجکستان کے جنوب مشرق میں پامیر واقع ہے۔ جس کے اطراف سے سیاحان قدیم داخل ہوا کرتے تھے۔ مارکو پولو نے اس کو "بامِ جہاں" کہا ہے۔ اس کی اونچی سر بفلک چوٹیاں ہمیشہ برف پوش رہتی ہیں اور ایک دل رُبا منظر پیش کرتی ہیں اس سرزمین میں شیریں پانی کے چشمے بھی بکثرت ہیں اور پہاڑوں میں مختلف قسم کی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ کوہ ہائے بدخشاں کا تو یہاں کے جغرافیہ میں ذکر ہے۔ ان

پہاڑوں میں نمک کی کانیں بھی ہیں۔ گویا سُرخ و سفید رنگت کے ساتھ ساتھ کانِ ملاحت بھی ہے۔ یہاں کے مشہور دریاؤں میں دریائے آمو ہے جس کے لیے مشہور اُستاد رودکی نے لکھا تھا۔

بوئے جوئے مولیاں آمد ہمے

یادِ یارِ مہرباں آید ہمے

اس کے علاوہ دریائے وحشی، کافرنہاں، دریائے جیحوں زرخیز اور سرسبز وادی کو ہی "ماورالنہر" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ یہ ہماری خوش بختی تھی کہ ہم اس تاریخی مقام پہ آج آ گئے۔ شاعرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے طفیل۔ اور اپنی قدیم تاریخ کے تانے بانے ملاتے اور کچھ سبیر کے بہانے۔

یہاں جنگلات میں بہت سے جانور پائے جاتے ہیں جن میں غزال تو شیراز میں ہیں۔ شاید غزالانِ ختن بھی یہاں ہی سے منسوب ہوں۔ آئندہ اگر جانے کا اتفاق ہوا تو اس کے متعلق ضرور دریافت کروں گی۔ غالباً ختن کاشغر کے قریب ہو گا۔ یہاں پر کپاس بہت پیدا ہوتی ہے۔ یہاں کی صنعتوں میں پارچہ بافی کی صنعت عام ہے اور پارچہ بافی کے کارخانے بہت ہیں۔ تاجکستانی زبان میں پنبہ کاری کہتے ہیں۔ کاشتکاری اور باغبانی بھی ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ باغبانی کو تاجکی زبان باغ داری کہتے ہیں۔ اور انگور کی کثرت کی وجہ سے شراب کشید کرتے ہیں۔ جیسے تاکداری کہتے ہیں۔ تاک کے لفظ سے مجھے ایک فارسی کے قدیم شاعر کا ایک شعر بہت یاد آیا۔

عشائیہ کے دوران ہمارے میزبان آغائے ایشمی نے انگوروں کے خوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عمرِ خیامؔ کا ایک شعر پڑھا جس میں انگور کی تعریف بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں مَیں نے انہیں ان ہی کے ایک اُستاد کا یہ شعر سُنایا ؎

تاک را سر سبز کُن اے ابرِ نیساں در بہار

قطرہ تا مے می تواند شُد چرا گوہر شود

جو انہیں بہت پسند آیا۔ انہوں نے اسے اپنے مخصوص انداز میں نظم کر پڑھا اور اسے دوبارہ ادا کیا۔

تاجکستان کی آبادی کا تناسب اس طرح ہے۔ تاجکستانی ۶۳ فیصد۔ ازبک ۲۳ فیصد۔ رُوسی تقریباً ۱۲ فیصد اور تاتاری ۲ فیصد۔ ان کے علاوہ یوکرائن، کرغیز، یہودی اور ترکمان قلیل تعداد میں آباد ہیں، ۶۳ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے دوشنبہ کے علاوہ بڑے شہر قراق، کولاب اور لینن آباد ہیں۔ لینن آباد کا قدیم نام خوجند تھا۔ تاجکستانی اور فارسی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ کم وبیش ایک ہی زبان ہے۔ ایران کے خاندان صفوی تک یہ زبان ایک تھی۔ اس کے بعد تاجکی زبان میں کچھ فرق آ گیا ہے۔ قدیم فارسی شاعروں کے تمام اُستاد رودکی، فردوسی، جامی، حافظ اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ حکیم بُو علی سینا اور فارابی بھی۔

دُوسری صبح دس بجے جشنِ اقبالؒ کا افتتاح تھا۔ جلسہ گاہ جاتے ہوئے راستہ میں فردوسی کی یادگار ایک عجائب خانہ تھا۔ اس سے کچھ دُور ایک باغ کے قریب سے گزرے جس میں رودکی کا باوقار مجسمہ استادہ تھا۔ آج جس عمارت میں جشنِ اقبالؒ منایا جا رہا تھا وہ تاجکستان کے مشہور انقلابی شاعر ابوالقاسم لاہوتی کے نام پر ہے اور ہمارے جشنِ اقبال کے میزبان آغائے ہاشمی نے بتایا کہ آج عظیم شاعر محمد اقبالؒ کا جشن خانۂ شاعر میں ہے۔ گزشتہ رات بارش ہوتی رہی تھی اور سڑک کے دونوں طرف سبزہ اور درخت دُھلے دُھلے نظر آ رہے تھے۔ لیکن بدلیوں کو چیر کر سُورج نکل آیا تھا۔ ہمارے میزبان نے موسم کی اس ادا کو یوں بتایا۔

خانم! "آفتابِ اقبال طلوع شد"

راستہ میں چند گزرگاہیں دکھاتے ہوئے آغائے ہاشمی نے بتایا کہ "خیابانِ فردوس" ہے۔ "یہ خیابانِ جامی" "یہ خیابانِ رودکی" ہے۔ تو میں نے اپنی سی فارسی میں عرض کیا کہ مناسب ہے کہ اب دوشنبہ میں "خیابانِ اقبالؒ"، بھی ہو تو وہ برجستہ بولے کہ "اقبالؒ ایں جا صاحب خانہ است"، ان کی بات سے مجھے پنجابی کے

وہ بول یاد آ گئے۔ "جس میں کسی نے اک پھول مانگا تو دینے والے نے پورا باغ ہی نچھاور کر دیا"، ان کے کہنے میں صداقت یوں بھی تھی کہ جشنِ اقبالؒ کی شام کی نشست میں تاجکستان کے ایک مشہور شاعر میر شکرؔ نے علامہ اقبالؒ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی نظم میں یوں کہا :- ع

بیا شاعر کہ صاحب خانہ ہستی

صبح کی مجلس میں اکثر تقاریر روسی زبان میں تھیں۔ سجاد صاحب نے اپنا مقالہ انگریزی زبان میں پڑھا۔ مگر ساتھ ساتھ اشعار فارسی زبان میں سنائے جو بہت پسند کیے گئے۔ اسی اثنا میں یہاں تاجکستان میں وسط ایشیاء کی تہذیب کی ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی ہو رہی تھی۔ جس میں حصہ لینے کے لئے یورپ، امریکہ، ایران، افغانستان، پاکستان اور ہندوستان سے آئے ہوئے نمائندے بھی موجود تھے۔ حسنِ اتفاق سے پاکستان سے آئے ہوئے جناب پروفیسر دانی صاحب بھی اس کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اور اسی رہائش گاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

پروفیسر دانی صاحب سے میری اور ریحانہ کی ملاقات اسلام آباد میں گزشتہ سال قائدِ اعظمؒ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں ہوئی تھی جس کا انتظام انہوں نے بہت خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ پروفیسر دانی قدیم گندھارا تہذیب کے بھی راز داں ہیں۔ اور چونکہ میرے بڑے بیٹے عشی کو گندھارا تہذیب سے بہت شغف ہے اس لئے اس کی ملاقات بھی ان سے ہوتی رہتی ہے۔ جشنِ اقبالؒ کمیٹی میں پروفیسر دانی اور ہندوستان سے آئے ہوئے سات افراد کے وفد، ایران اور افغانستان کے نمائندوں کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی۔ اس صبح کی مجلس میں افغانستان اور ایران کے مقرروں نے علامہ اقبالؒ پر نہایت فصیح و بلیغ مقالے پڑھے۔ اس نشست کے بعد ہم سب کو آغائے اینمی مرزا ترسون زادہ کی قبر پر پھول چڑھانے کے لئے لے گئے۔ مرزا ترسون زادہ تاجکستان کے بہت نامی شاعر تھے۔ دوسرے دن ہماری درخواست پر آغائے اینمی بابا جان غفور رؤف کی قبر پر فاتحہ پڑھنے

کے لئے لے گئے۔ بابا جان عفور رؤف کی پاکستان دوستی اور ہم سے بے پایاں شفقت کے خراج میں ہم کم از کم یہی کر سکتے تھے کہ وہاں جا کر فاتحہ پڑھیں اور پھولوں کا نذرانہ پیش کریں۔ بابا جان کی اہلیہ محترمہ ماسکو سے آئی ہوئی تھیں۔ بابا جان کی دو بہنیں بھی وہاں موجود تھیں اور بہت اصرار سے ہمیں اپنے گھر چائے کے لئے لے گئیں اُن کا گھر باہر سے یوں معلوم ہوا جیسا کہ پشاور کے نواح میں آ گئے ہیں۔ پائیں باغ میں گلاب کی کیاریاں، بادام، شفتالو کے درخت، برآمدہ میں تخت پوش بچھے ہوئے۔ اندرونِ خانہ جا کر بھی مشرقی مہمان نوازی کا پورا پورا ثبوت ملا۔ بابا جان کی بہن نے کمال مہربانی سے اپنے ہاتھ سے کئی چیزیں بنا کر چائے کے ساتھ رکھیں۔ ان کے ہاں کا بنا ہوا قیمہ کباب، بالکل ہوصل کے قیمہ سے ملتا تھا۔

شام کی نشست ایک دوسرے وسیع ہال میں منعقد ہوئی جہاں پر تاجکستانی بوڑھے جوان، مرد اور عورتیں بڑی تعداد میں موجود تھے، جیسے ہی ہم ہال میں داخل ہوئے پاکستان اور اقبال کے نام پر پرجوش تالیاں بجائی گئیں۔ حاضرین کے چہروں سے پاکستان سے خلوص اور محبت کے تاثرات نظر آتے تھے۔ اُس وقت کی نشست تاجکی زبان میں تھی۔ سجاد صاحب سے بھی تاجکی زبان میں ہی تقریر کرنے کی استدعا کی گئی اور خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے اس کو بخوبی نباہ ہی دیا۔ سامعین نے بار بار تالیاں بجا کر ان کے مفہوم سمجھ جانے کا ثبوت دیا۔ پس منظر میں علامہ اقبال کی ایک بہت بڑی باوقار تصویر آویزاں تھی جس سے اس محفل کی زینت اور بڑھ گئی تھی۔

ایران کی نمائندہ خانم نے بھی اقبال کو بہت خوبصورت الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ تاجکستانی شاعروں نے علامہ اقبال کے اعزاز میں نظمیں پڑھیں۔ ان میں مشہور تاجکی شاعر آغا میر شکر کی نظم کے یہ اشعار مجھے بہت پسند آئے:۔

نگہ اب تک دیارِ دل کشایت — بروئے نو دلش را یار کرد است
بہ استقبالت اے خورشیدِ ملت — جہانی آسمانی ساز کرد است

جہانی کہ در آں ہر نکتۂ تو ۔۔۔ چراغ محفل پیر و جواں است
زبان غنچہ ہائے بے زبانی ۔۔۔ ہر مرغان چمن داستاں است

آغا حمید ہاشمی نے اس محلس اقبال میں سپاسنامہ پیش کیا جس میں انہوں نے علامہ اقبال کو مشرق کے اندھیروں کو دُور کرنے کے لیئے چراغ اور شمع کے طور پر پیش کیا۔ اقبال کی تعلیم سوئے ہوئے مشرق کے لیئے بانگِ درا ثابت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ تاجکستان کے بچّہ بچّہ کو اقبال اور اس کے پیغام سے محبت ہے اور کوئی ایسا گھر نہیں جہاں اقبال کی کوئی نہ کوئی کتاب موجود نہ ہو۔ اقبال ہمارا بھی شاعر ہے۔ اس محلس میں تقاریر کے بعد تاجکستانی غنائیہ پروگرام پیش کیا گیا جس میں چند تاجکی نوجوانوں نے نہایت ہی پُر اثر آواز میں موسیقی کے ساتھ اقبال کی چند فارسی نظمیں پیش کیں۔ سب سے پہلے انہوں نے اقبال کی مشہور نظم "اے جوانانِ عجم" پیش کی۔

چوں چراغِ لالہ سوزاں در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم، جانِ من جانِ شما
فکر رنگینم کُند نذرِ تہی دستانِ شرق
پارۂ لعلِ کہ دارم از بدخشانِ شما

اس نظم کو حاضرین نے بار بار سُنا۔ ایسا معلوم ہوا جیسا کہ تمام محفل پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو۔ اس کے بعد ایک نوجوان نے ولولہ انگیز انداز میں "از خواب گراں خیز" کو موسیقی کے ساتھ پیش کیا۔ خصوصاً یہ شعر بہت موزوں اور حسبِ حال تھا۔

خواجہ ز سروری گذشت، بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت، دورِ سکندری گذشت

اس کے ساتھ ساتھ اقبال کی نظموں کے پس منظر میں چند رقص پیش کیئے گئے۔ اس کے بعد ایک تاجکستانی خاتون شائستہ جان نے نہایت سُریلی آواز خالص پنجابی انداز میں پنجابی کا مشہور نغمہ "بلے بلے" سُنایا۔ جو نہایت پسند کیا گیا۔ اسی پروگرام میں چند پیاری پیاری تاجکی لڑکیوں نے شلوار قمیص پہن کر پاکستانی رقص "لڈی" پیش کیا۔

اس کے بعد لڑکوں نے سرحدی خٹک رقص، بچیاں، شلوار قمیض پہنے اور دوپٹے اوڑھے بالکل پنجابی بچیاں معلوم ہوتی تھیں۔ ہماری استعجاب آمیز مسرت کی انتہا ہو گئی۔ جب ایک نوجوان نے انتہائی دلنوازی سے "سوہنی دھرتی" کا نغمہ بہت ہی مدھ بھری طرز میں گایا۔ شہناز جو کہ بنگلہ دیش چلی گئی ہیں ان کا یہ نغمہ مجھے بہت ہی پسند ہے۔ لیکن اس کے تاجکی فنکار کی آواز سے ایک خاص مسرت محسوس ہوئی۔ سجاد صاحب نے اسٹیج پر جاکر خود اُن فنکاروں کو داد دی اور حضرت امیر خسروؒ کی زبان میں کہا: ع

"کرم کردی الٰہی زندہ باشی"

حاضرین پر اس مصرعہ کا بہت اچھا اثر ہوا چونکہ حضرت امیر خسروؒ اسی خطہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اسی رات عشائیہ میں آغائے ایشی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ سجاد صاحب نے اس کے جواب میں ان کی مہمان نوازی کا اقبال کے پاکستان کی طرف سے شکریہ ادا کیا اور پاکستانی عوام کا تاجکستانی عوام کو سلام محبت پیش کیا۔

۲۲ر اکتوبر کی صبح کو ہم قریبی مضافات میں نورک دیکھنے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا جدید شہر ہے۔ آغا مُراد نے اس شہر کے نام کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے ذکر کیا کہ یہ نام غالباً انار کے درختوں کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے چونکہ انار کے درختوں کے باغات کافی نظر آئے۔ راستہ میں ایک دریا کافرنہاں کے پُل سے گزرے آغا مراد نے اس نام کی وجہ تسمیہ پُوچھنے پر بتایا کہ زمانہ قدیم میں کہتے ہیں کہ چند کافروں کو ختم کر کے اس دریا میں ڈال دیا تھا۔ نورک شہر کے پاس سے دریائے وحشی بہتا ہے جس پر بہت بڑا بند باندھ کر بجلی پیدا کی گئی ہے اور یہ بجلی نہ صرف تاجکستان بلکہ قرب وجوار کے علاقوں کو بھی مہیا کی جاتی ہے۔ دریائے وحشی کا نام بھی اسم بامسمیٰ ہے۔ یہ دریا برسات کے موسم میں بہت ہیجان خیز ہوا کرتا ہے اور اس کی طغیانی سے آس پاس کے شہروں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ اس بند سے اس کے پانی کو

مقید کر لیا گیا ہے۔

میں نے تورک کے میئر (MAYOR) سے اُن کی اس فراست کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آغا شما دریائے وحشی رام کردی۔ ان کے دفتر سے ہم موٹر میں بیٹھ کر اس بند پانی کا ذخیرہ بھی دیکھنے گئے۔ یہ سنگلاخ پہاڑیوں کے بیچ میں گھری ہوئی نیلگوں جھیل کا نظارہ بہت دلفریب ہے۔ اکثر سیاح یہاں آ کر کشتی رانی کرتے ہیں اور مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ یہاں کے میٹھے پانی کی مچھلی مہاشیر بہت لذیذ ہے (یہ مچھلی کا نام بھی غالباً ہم نے ان ہی سے لیا ہے) واپسی میں ہم ایک چشمہ کے پاس سے گزرے اور وہاں آس پاس زرد آلو کے باغات تھے۔ شہر کی طرف لوٹتے ہوئے پنبہ یعنی کپاس کے کھیت نظر آئے اور پنبہ لفظ کی رعایت سے مجھے استاد رودکی کا یہ قدیم شعر یاد آ گیا۔ جس کا حوالہ مولانا شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں دیا ہے۔ مولانا شبلی کے خیال کے مطابق یہ فارسی کا پہلا شعر ہے ؎

اُشتر صراحی گردنا دانم چہ خواہی کردنا
گردن درازے می کنی پنبہ چہ خواہی خوردنا

واپسی پر کمرۂ طعام میں آئے تو ہماری دوست ایرانی خانم کے سوا اور مہمان کھانا کھا چکے تھے۔ لنچ کے دوران خانم سے قدیم ایشیائی تہذیب پر دلچسپ گفتگو رہی۔ خانم نے سجاد صاحب کو دیوانِ حافظ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "جواب مہربانی مہربانی بست ا۔ دیوانِ حافظ تاجکستان کی پیاری سرزمین میں ایک مقدس اور یادگار تحفہ ہے۔

۴ بجے شام کو آغا مراد کے ساتھ دوشنبہ کے بازار دیکھے۔ کچھ پھلوں کی خریداری کی۔ تاجکستانی میوہ فروش یہ معلوم کر کے کہ میں پاکستانی ہوں بے حد محبت اور یگانگت سے پیش آئے۔ اخروٹ کو یہاں چار مغز کہتے ہیں۔ یہ میرے لئے ایک دلچسپ انکشاف تھا۔ انار لیتے ہوئے جب میں نے پھل والے سے فارسی میں پوچھا کہ جناب ترش تو نہیں ہیں تو اس نے نہایت اخلاق سے کہا کہ پاکستان کے لئے ہم کیسے ترش دے سکتے ہیں۔ پاکستانی تو ہمارے عزیز ہمسایہ ہیں۔ برادر ہیں۔

۲۲ر اکتوبر کو ہم رات کو ڈیڑھ بجے دوشنبہ سے چلے اور صبح نور کے تڑکے ماسکو ایرپورٹ پر پہنچے۔ دوشنبہ کے اس قلیل قیام نے دو عظیم تاثرات دیئے۔ ایک یہ کہ اقبال ہمارے محبوب شاعر ہوتے ہوئے مشرق کے عظیم شاعر ہیں۔ دوم اہلِ دوشنبہ کا دوستی اور محبت کا رشتہ مضبوط رشتہ ہے جو پاکستان سے دائم و قائم ہے۔

○

ماسکو میں یومِ اقبالؒ

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلہ میں دو مارچ کو ماسکو میں پاکستانی سفارتخانے نے یومِ اقبالؒ منایا اور بہت دُھوم دھام سے پروگرام کے پہلے حصے میں ایران، ترکیہ، مصر اور پاکستان کے سفیروں کی تقریریں ہوئیں۔ ان سب نے بہت فصاحت سے اپنی اپنی تقریروں میں شاعرِ مشرق کو خراجِ عقیدت نہایت احترام سے پیش کیا۔

تاجکستان کے شعبۂ شرقیہ کے صدر آغائے ایشمی صاحب ہماری دعوت پر خصوصاً اس جشن میں حصہ لینے کے لئے دوشنبہ سے تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں علامہ اقبالؒ کو مشرق کے لئے روشنی کا ایک مینار ثابت کیا اور زبورِ عجم اور جاوید نامے سے ان کے بہت سے اشعار دلکش انداز میں پڑھے۔

پروگرام کے دوسرے حصے میں فارسی اور اردو کا منتخب کلام پاکستانی بچوں نے پیش کیا۔ سفیرِ ایران اور آغائے ایشمی کو ہمارے بچوں کا ترنم سے ان نظموں کا پڑھنا تو بہت ہی پسند آیا۔ خصوصاً یہ اشعار

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما

اور ~ معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز!

ع ۔ از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

ایک تاجکی نوجوان سیف الدین نے بالِ جبرئیل سے ایک اُردو نظم اور زبورِ عجم سے ایک فارسی نظم اپنی گٹار کے ساتھ جب سُنائی تو حاضرین جھوم جھوم گئے۔

سامنے سٹیج پر میز کے اُوپر علامہ اقبالؒ کی تصویر کے ساتھ چاندی کے شمع دان میں موم بتی روشنی کا ہالہ بنائے ہوئے بہت دلفریب نظر آرہی تھی۔ ایک دُوسری میز پر علامہ اقبالؒ کی تمام فارسی اور اُردو کی کتابیں نمائش کے لئے رکھی تھیں اور ایک خوبصورت منقش مصری گلدان میں تازہ گُلِ لالہ اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ یہ محفل یہاں کے مشہور ہوٹل "پراگہ" (PRAGA) کے ایک خوبصورت ہال میں منعقد ہوئی۔ ہمارے مغلیہ محلات کے شیش محل کی طرح اس وسیع ہال کی تمام دیواریں آئینوں سے مزیّن ہیں بلکہ یوں کہیئے کہ یہ آئینہ خانہ ہے۔ ان آئینوں میں چاروں سمت سے علامہ اقبالؒ کی مختلف تصاویر الگ الگ زاویوں سے نظر آرہی تھیں اور ایک خصوصی دلپذیر اور خوش کن منظر پیش کر رہی تھیں۔

اس تقریب کے لئے دعوت نامے وقت کی کمی کی وجہ سے صرف دو تین روز پہلے ارسال کیئے گئے تھے۔ اس کے باوجود ڈھائی تین سو سے زیادہ حاضرین نے شرکت کی۔ جن میں کئی ملکوں کے سفیر اور ان کے نمائندے شامل تھے۔ سوویٹ یونین کے وزارتِ خارجہ کے شعبۂ ایشیا کے تمام معزز اراکین نے بھی شرکت کی اور "ماسکو اورینٹل سٹڈیز" کے علوم شرقیہ کے پچاس کے قریب فارسی اور اُردو کے ماہرین نے بہت ذوق و شوق کے ساتھ اس تقریب میں حصّہ لیا اور نہایت انہماک کے ساتھ تقاریر اور دُوسرے پروگرام کو سُنا۔ مقالوں اور نظموں کے بعد حاضرین کے لئے پُرتکلّف دعوت کا بھی انتظام تھا۔ علامہ کی تصویر کے پسِ منظر میں بہت سی تصاویر لی گئیں۔ اور حاضرین ان کی کتابوں کے اس قدر شائقین نکلے کہ سجاد صاحب کو وزارتِ خارجہ اسلام آباد کو تار دینی پڑی کہ برائے کرم علامہ کی تصانیف کثیر تعداد میں جلد روانہ کرے۔ آئرلینڈ۔ ناروے اور بلجیم کے سفیر اور ان کی بیگمات نے سجاد صاحب کی تقریر سُن کر ہمارے اس عظیم شاعر کے کلام کا انگریزی زبان میں ترجمے کی پُرزور سفارش کی۔ اس طرح جمیکا، رومانیہ۔

سری لنکا اور بہت سے مغربی ممالک کے سفیروں نے بھی اس کی خواہش ظاہر کی۔ ان حاضرین کے لئے یہ بہت تعجّب خیز بات تھی کہ علاّمہ اقبالؒ مشرق و مغرب کے اتنے زبردست دانائے راز ہیں۔ سجاد صاحب نے اپنی تقریر میں بہت سے فارسی اشعار سے استفادہ حاصل کیا۔ مثلاً ؎

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی!

یا پھر ؎

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
ایں حیثیتِ غبارے را انجم بسجود آمد!

ریحانہ نے ان سب اشعار کا ترجمہ بہت محنت اور خوبصورتی سے کیا۔ ان خیالات کو سن کر ہمارے مغرب کے اکثر دوست حیران سے ہو گئے کہ کیا مشرقی دل و دماغ بھی خودی اور عزتِ نفس کا اس بلندی سے اظہار کر سکتے ہیں۔

متعدد اخبار نویس اور ریڈیو ماسکو کی نمائندہ خواتین، پاکستان کے اس پروگرام کو نشر کرنے کے لئے موجود تھے۔ دوسرے دن یہ پروگرام براہِ راست ریڈیو ماسکو سے پاکستان کے لئے اُردو کے پروگرام میں نشر کیا گیا۔

ماسکو میں پاکستانی سفارت خانے کا عملہ بہت مختصر ہے۔ اس لئے اس پروگرام کی تیاری کے لئے ہمیں بچّوں کو تقریباً اڑھائی ماہ تک ریہرسل کرانی پڑی۔ لیکن اس محنت کا نتیجہ اُمید سے بڑھ کر خوش کن ہُوا۔ یوں سمجھئے کہ علاّمہ اقبالؒ کے سال میں یہ ہماری طرف سے ان سے عقیدت کی ایک مختصر کوشش رہی۔ لیکن بقول شاعرے ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

○

مکتوب ماسکو

۱۷

پاکستان اور سوویت یونین کے سفارتی تعلقات کی

تیسویں (۳۰) سالگرہ

۲۲ اپریل کو سوویٹ یونین میں ولیدی میر ایلیچ لینن (VLADIMIR — ILYICH LENIN) کی ۱۰۸ ویں سالگرہ منائی گئی۔ سوویٹ یونین کے ہر چھوٹے بڑے شہر اور قصبہ اور گاؤں میں خصوصی تقریبات ہوئیں۔ ریڈیو۔ ٹی۔ وی پر پروگرام، بچوں کے لئے سینما میں خاص فلمیں اور کریملین محل میں جناب بریژنیف صاحب کی صدارت میں جلسہ اور رات کو چراغاں......

اس دن حسنِ اتفاق سے سبوٹنک (SUBBOTNIK) کا تہوار تھا۔ یہ لفظ سبوٹنک لفظ سبیتو سے نکلا ہے۔ عبرانی زبان میں سبیتھ ہفتے کو کہتے ہیں جیسے عربی میں "سبت"

سوویٹ یونین میں سال میں ہفتے کے ایک روز سب باشندے بخوشی چند گھنٹے کسی نہ کسی سدھار کے کام میں صرف کرتے ہیں۔ چاہے کوئی پود الگائیں یا اپنی گلی کوچوں کی صفائی میں حصہ لیں۔ اس روز ہم نے دیکھا کہ شہر اور شہر سے باہر تمام بڑے چھوٹے ذوق وشوق سے کسی نہ کسی کام میں مشغول تھے۔ اس صبح رانی کی پیانو کی استانی بھی وقت سے ایک گھنٹہ پہلے آئی تا کہ واپس جاکر کسی قومی خدمت میں حصہ لے۔

ہم اس روز جو سعد کو لے کر ماسکو سے باہر اولمپک (OLYMPIC) کا نیا بنتا ہوا گاؤں دیکھنے گئے تو دیکھا کہ بہت سے لڑکے اور لڑکیاں بیلچے اور کدالیں لے کر

گاؤں کے قریب کے گھنے جنگل کے درختوں کی نوک پلک سنوار رہے ہیں۔ اس سال یہ تہوار لینن کی سالگرہ کے ساتھ ساتھ آیا۔ لہٰذا اس روز اس کو زیادہ اہمیت ملی۔

---

۶ مئی : آج ایوانِ دوستی میں پاکستان اور سوویٹ یونین کے سفارتی تعلقات کی ۳۰ سالہ سالگرہ منائی گئی۔ (اسلام آباد میں بھی رُوسی سفارت خانے میں اس سلسلے کی ایک تقریب منعقد ہوئی) دونوں ممالک کے سربراہوں سے ایک دُوسرے کو تہنیت کے پیغام وصول ہوئے۔ ایوان دوستی کی قدیم اور پر شوکت ہال میں جلسہ کی کارروائی شام کے چھ بجے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے آرکسٹرا نے پاکستان اور سوویٹ یونین کے قومی ترانے بجائے۔ اس کے بعد سوویٹ یونین کی حکومت کے معزّز ارکان نے اپنی تقاریر میں مُبارکباد پیش کی اور پاکستان کے عوام اور حکومت سے زیادہ دوستی کے عہد و پیمان استوار کیے۔ سفیرِ پاکستان نے بھی اپنی تقریر میں اپنے ملک اور اپنی عوام کی طرف سے سوویٹ یونین کی حکومت اور عوام کا بہت شکریہ ادا کیا اور آپس کے خوشگوار تعلقات کو مزید بڑھانے کی تمنّا بھی ظاہر کی۔ ان تقاریر کے بعد پاکستانی سفارت خانے کے ارکان اور دیگر مہمانوں کے لیۓ دعوت کا انتظام بھی تھا۔ ضیافت کے بعد ایک دلچسپ اور رنگین کنسرٹ پیش کیا گیا جس میں کلاسیکی رقص اور بیلے بھی تھا اور عوامی گیت کے ساتھ ساتھ جادُو کے کمالات دکھائے گئے اور بعد میں وسط ایشیا کا ایک دلکش رقص بھی مشرقی موسیقی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس تقریب میں وزارتِ خارجہ کے بہت معزز اور اہم ارکان عموماً اور پاکستان سے تعلّق رکھنے والے شعبہ سے خصوصاً شامل تھے۔ بہُت سے رُوسی عورتیں و مرد، طالب علم۔ ریڈیو۔ ٹی۔ وی اور اخبارات کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔

اس تقریب میں فیضؔ صاحب کو ایوانِ دوستی میں اچانک دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گذشتہ ماہ جناب حکیم محمد سعید صاحب اور جناب فیضؔ صاحب تاجک شاعر

صدرالدین عینی کی صد سالہ سالگرہ منانے کی تقریب میں دوشنبہ آئے تھے۔ وہاں سے واپس آکر فیض صاحب قزاقستان کی ری پبلک کی دعوت پر ان کے دارالخلافے آلما آتا گئے اور کل رات ہی غالباً واپس ماسکو لوٹے۔ فیض صاحب نے بتایا کہ آلما آتا ایک بے حد جدید اور خوبصورت شہر ہے جس کی عمارات سر بہ فلک ہیں اور باغات کی سرسبزی دوشنبہ سے متشابہ ہے۔ قصّہ یوں کہ یہ شہر قابلِ دید ہے۔ اب تو ایرو فلوٹ (روس کی ہوائی سروس) نے 144-TU (جیسے برطانوی اور فرانسیسی جہاز کنکورڈ) کی سروس شروع کی ہے اور یوں ماسکو اور الما آتا کا طویل سفر بہت جلد طے ہو جاتا ہے اور چشم زدن میں ماسکو سے الما آتا پہنچ جاتا ہے۔

صدرالدین عینی کی صد سالہ سالگرہ

۱۸ مئی کو یہاں ماسکو کے شہرۂ آفاق بالشوئے تھیٹر میں بھی تاجکستان کے شاعر صدرالدین عینی کی صد سالہ سالگرہ بہت اہتمام سے منائی گئی۔ دعوت نامے میں سنہری روپہلی جدول لگے رقعے کے ساتھ کوٹ پر ٹانکنے کے لئے میڈلین نما بیج بھی منسلک تھے جس پر صدرالدین عینی کی شبیہ تاجکی ٹوپی پہنے ہوئے اور نیچے سنہری حروف میں لکھا ہوا ۱۰۰ کا ہندسہ۔ میں اور ریحانہ اس تقریب میں شامل ہوئے۔ سجاد صاحب دفتری مصروفیت کی وجہ سے نہیں جا سکے۔ بالشوئے تھیٹر کی شاندار سٹیج کے پسِ منظر میں عظیم تاجک شاعر صدرالدین عینی کی قد آور تصویر آویزاں تھی۔ سر پر بھی وہی تاجکی ٹوپی (جیسے لکھنؤ کی کڑھت ہو) اور انگرکھا زیب تن یوں معلوم ہوا جیسے فرحت اللہ بیگ کی لکھی ہوئی "دلّی کی آخری شمع" کے کوئی شاعر ہوں۔

پروگرام کے اوّل حصے میں روسی، تاجک، ازبک، بیلے روسیا اور آذربائیجان کے دانشوروں نے فارسی کے اس عظیم شاعر کو نظم و نثر میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا مگر روسی میں، کاش! کہ یہ سب فارسی میں ہوتا۔ حاضرین میں کئی ہزار روسی شائقین تھے۔

خال خال رنگ برنگ اطلس کی پوشاک پہنے ازبک اور تاجک خواتین محفل میں قوس و قزح کا رنگ بکھیر رہی تھیں۔ وقفے کے بعد کا پروگرام تاجک زبان یعنی دری نما فارسی میں تھا۔ پردۂ سیمیں کے اُٹھتے ہی سو کے قریب حسین تاجک لڑکیوں نے سبز پشواز، شلوار سنہری صدری ٹوپی اور گل اناری مہین ریشم کے دوپٹے پہنے ہوئے (جیسے ہماری والدہ کے زمانے میں گاج کیا جاتا تھا۔) گویا سرتاپا انار کی کلیاں بنی ہوئی موسم بہار کا رقص پیش کیا۔ پس منظر میں انار کے سرسبز درخت شگوفوں سے لدے پھندے نظر آرہے تھے۔ اس رنگین رقص کے دُوسرے منظر میں سرو بالا اور بادام کے درخت شگوفوں سے لدے پردے پر بالکل اصلی نظر آرہے تھے۔ اس کے بعد سٹیج کے اس چھوٹے سے چمن زار میں کوئی تقریباً پچاس لڑکیوں نے سُنہری پشواز اور سُنہری ہی ٹوپیاں پہنے، ہاتھ میں دف لئے ہلکے ہلکے سُروں پر صدرالدین عینی کی ایک غزل گائی۔ اس کے بعد شہنائی اور رُباب کے سُروں پر ایک خوبصورت رقاصہ نے فارسی کی ایک عوامی دُھن پر بہت نزاکت سے رقص کناں گانا شروع کیا۔ جس کا ایک مصرعہ کچھ یوں تھا۔

رضی جان چہ اے روی

رضی جان . . . . . .“

اس مصرعہ کی بار بار تکرار تھی۔ اس رقص پر حاضرین نے تالیوں کی گونج سے بہت داد دی اور رقاصہ کو سٹیج پر بار بار آنا پڑا۔ ابھی یہ دلچسپ رنگین پروگرام جاری تھا کہ ہمیں مجبوراً آنا پڑا کیونکہ آٹھ بج رہے تھے اور اسی وقت ہمیں سفیر پرتگال کے ہاں عشائیہ میں جانا تھا۔ سجاد صاحب کو وقت کی پابندی کا خیال رہتا ہے ورنہ آنی اور میں کچھ دیر اور اس محفل سے لطف اندوز ہوتے۔

○

مکتوبِ ماسکو
۱۸

ماسکو میں یومِ خواتین

سال میں عورتوں کا ایک دن

ماسکو میں ہر سال ۸ مارچ کو عالمی یومِ خواتین منایا جاتا ہے۔ اس تقریب کا اہتمام سوویت یونین میں ہر جگہ نہایت دھوم دھام سے کیا جاتا ہے۔ یومِ خواتین کے سلسلہ میں ہر سال ماسکو میں مادام وکٹوریہ برزنیف کی طرف سے بیرونی ملکوں کے سفیروں کی بیگمات کو مدعو کیا جاتا ہے، ۱۹۷۷ء میں اس موقعے پر میں پاکستان تھی۔ لہذا اس تقریب میں شریک نہ ہو سکی۔ مگر ۱۹۷۶ء میں یہ تقریب کریملن پیلس کے ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ جس کے بارے میں غالباً میں پہلے ذکر کر چکی ہوں۔

اس سال یہ تقریب لینن ہلز پر، سرسبز درختوں اور دریائے ماسکو کے پس منظر میں سرکاری مہمان خانے کے ہال میں منعقد ہوئی۔ مجھے یہ عمارت پہلی دفعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ عزیزہ ریحانہ کو بھی بلاوا تھا۔ لہذا ہم گھر سے ڈیڑھ بجے کے قریب روانہ ہوئے۔ دو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ کہ ہم اس پرشوکت عمارت کی ڈیوڑھی پر پہنچے۔ برف گر کر تھم چکی تھی مگر "لینن ہلز" کی پہاڑیاں، درخت اور قریب میں بہتا ہوا دریائے ماسکو تمام برف پوش تھے۔ ڈیوڑھی میں قطار در قطار موٹریں آ جا رہی تھیں۔ اور روس اور بیرونی ممالک کی خواتین قسم قسم کے فر اور سنجاب وسمور کے کوٹ اور ٹوپیوں میں لپٹی ہوئی، ترقی اور اندر داخل ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ بیرونی

ڈیوڑھی کے اندر "پروٹوکول" کی خواتین استقبال کے لئے کھڑی تھیں۔

ہم ایک حسین غلام گردش سے گذرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ہال میں پہنچے۔ سنگ مرمر کے اس ہال میں دیواروں پر سنہری پچکاری کی گئی ہے اور چھت کے عین درمیان ایک بے حد خوبصورت بلور کا جھاڑ آویزاں ہے۔ استقبالیہ کی صف میں برژنیف صاحب کی صاحبزادی اوّل تھیں۔ صاحبزادی اپنے والد محترم سے مشابہ ہے۔ (اکثر لڑکیاں باپ کی ہم شکل ہوتی ہیں) انہوں نے فیروزی اور نارنجی رنگ کے پھولوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ اور اسی رنگ میں ریشمی جھالر لگی سلک کی شال شانوں پر ڈال رکھی تھی۔ بقول ریحانہ انگوٹھی بہت دیدہ زیب پہن رکھی تھی۔ کانوں میں آویزے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ دوسری معزز بیگمات بھی قطار میں تھیں۔ جن میں وزیر خارجہ گرومیکو صاحب کی بیگم بھی تھیں انہوں نے سفید اور سرمئی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ ان کے بال مشرقی خواتین کی طرح سیاہ ہیں مادام برژنیف صاحبہ بعد میں تشریف لائیں۔

کمرے کے اس پُروقار پس منظر میں آرکسٹرا آہستہ آہستہ دلکش دھنیں بجا رہا تھا۔ سب میزبان خواتین تھوڑی دیر کے بعد ہم سب خواتین کے ساتھ کمرۂ طعام میں آگئیں۔ یہاں میزوں پر انواع و اقسام کی کھانے کی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ ماسکو میں مجھے تمام دعوتوں میں جو چیز انوکھی نظر آتی ہے وہ تازہ میوہ ہے، موسم سرما میں یہ پھل بازار میں عام طور پر نظر نہیں آتے) مثلاً تاجکستان یا ازبکستان جارجیا آرمینیا سے آئے ہوئے سیاہ انگور اور سرخ سُرخ سیب تھے۔ طشتریوں میں نمکین تلے ہوئے۔ بادام بھی تھے۔ بقول سفیر نیپال کی بیگم کے، ہیں ایسی دعوتوں میں صرف انگور کے ان تازہ خوشوں کی گاہک ہوں۔

خورونوش کے طویل شغل کے بعد مادام وکٹوریہ برژنیف نے یوم خواتین کے متعلق ایک تقریر روسی زبان میں کی۔ جس میں اس روز کی اہمیت کا ذکر کیا اور یہ

بھی بتایا کہ آج روس میں عورت کو کتنی فوقیت حاصل ہے۔ یہاں زندگی کے ہر شعبے میں عورت کو برابر کا شریک سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے خواتین عالم کو اس دن کے لئے اپنی بہترین تمنائیں اور مبارکباد پیش کی۔ ان کی تقریر کا ترجمہ روسی ترجم خواتین نے پہلے انگریزی میں اور بعد میں فرانسیسی میں نہایت برجستگی سے کیا۔

ماسکو میں سفیر کینیڈا مسٹر فورڈ سفارتی کور کے ڈین ہیں۔ ان کی بیگم آجکل ماسکو میں نہیں ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں سفیر قبرص کی بیگم نینا نے (یہ سفیر کینیڈا کے بعد یہاں کے سب سے سینئر سفیر ہیں۔ اور تقریباً دس سال سے مقیم ہیں) مادام وکٹوریہ بریژنیف کا ہم سب کی طرف سے روسی زبان میں شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد میڈیم بریژنیف نے جو کہ سادہ سا بادامی رنگ کا ادنی جیکٹ پہنے بہت باوقار نظر آرہی تھیں۔ فرداً فرداً ہم سب سے آکر ہاتھ ملایا اور دوبارہ مبارکباد پیش کی۔ بیگم گرومیکو بھی ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ نہایت ملنسار خاتون ہیں اور انگریزی بول لیتی ہیں۔ ان سے میری کافی دیر بات چیت ہوئی وہ ریحانہ کو بھی پیار کرتی رہیں۔

مادام بریژنیف کی تقریر کے بعد ایک روسی خاتون سے میں نے برسبیل تذکرہ یہ ذکر کیا کہ خواتین کو جو مساوی حقوق مغرب نے اب دیئے ہیں۔ اور مغرب کی خواتین اس پہ بہت نازاں اور شاداں ہیں مگر اسلام نے عورت کو یہ حقوق آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے دے رکھے تھے یہ اور بات ہے کہ مسلمان مرد غلط رسوم وقیود کے پابند ہو کر ان سنہری قوانین کو کسی حد تک فراموش کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود اسلام میں ماں کا درجہ بہت بلند ہے۔ کہ ایک عورت کو ماں کی حیثیت سے اس سے زیادہ بلند رتبہ کیا مل سکتا ہے کہ اس کے پاؤں تلے جنت ہو۔ میں نے بتایا کہ اس سال جب ہم شاعر مشرق کا سال منارہے ہیں۔ ان کے اشعار نے عورت کی عظمت کو تسلیم کیا ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی

کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں

ماسکو میں یوم خواتین کا ایک غیر رسمی دستور یہ بھی ہے کہ آج کے دن خواتین صرف خواتین ہی سے رقص کرتی ہیں۔ لہٰذا ایک دوسرے وسیع ہال میں روسی بینڈ کے ساتھ ایک گھنٹے کے لئے خواتین باہم رقص کرتی ہیں۔ یہ پر لطف دلچسپ نظارہ تھا۔ ایشیائی افریقی، امریکی، لاطینی امریکی اور یورپی خواتین کے لباس کے مختلف رنگ اور انداز قوسِ قزح کا منظر پیش کرتے رہے۔ اکثر روسی دھنیں بھی بہت رسیلی ہیں۔

میرے پاس بیٹھی مسز کوسیگن نے مجھ سے پوچھا کہ تمہاری بیٹی کیوں نہیں رقص کر رہی؟ ان کے کہنے پر ریحانہ بھی ترکی سفیر کی بیٹی کے ساتھ شاملِ رقص ہو گئی۔ مادام بریژنیف صاحبہ نے بعد میں ہم سب کو یادگار کے طور پر چھوٹی چھوٹی رنگین منقش لکڑی کی بنی ہوئی مخصوص روسی گڑیا تحفتاً پیش کیں اور ہاں اس سے یاد آیا کہ مادام وکٹوریہ بریژنیف کے دعوتی رقعے کے ساتھ ہر ملک کے سفیر کی بیگم کو شہکار روسی تصویروں کا ایک مطبوعہ البم بھی دیا گیا تھا۔ چھ بجے ہم لوگ واپس گھر آ گئے۔

اس تقریب کی دوسری کڑی ۷ مارچ کو پانچ بجے بعد دوپہر کا بلاوا تھا یہ کارڈ بالشوئی تھیٹر کی طرف سے تھا۔ آٹھ مارچ کی تقریب ہر سال اُس قدیم تھیٹر کے خوبصورت ہال میں منائی جاتی ہے۔ آسمانی رنگ کے دعوتی کارڈ کے اوپر سُرخ اور سنہری رنگ میں پوری دنیا کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس پر آٹھ کا عدد سُرخ اور سنہری رنگوں میں لکھا ہوا تھا۔ جب ہم بالشوئے تھیٹر میں پہنچے تو ہال خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس وسیع ہال میں آٹھ گیلریاں ہیں۔ سُرخ بنات کے پردے، سُرخ مخمل کی کرسیاں اور صوفے سنہری جدول کے ساتھ تھے۔ اس ہال میں تقریباً پانچ ہزار افراد کی نشستیں ہیں۔ یہاں مہمانوں کے استقبال کے لئے "ڈپٹی چیف آف پروٹوکول" موجود تھے۔ پیچ در پیچ غلام گردشوں سے گذر کر ہم اپنی نشست پر پہنچے ہی تھے۔ کہ پروگرام شروع ہونے کی گھنٹی بجی۔ سفارت کاروں کی گیلری میں اگلی صف میں یوگوسلاویہ

کے سفیر کی بیگم کے قریب کی کرسی خالی تھی۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے ساتھ کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

پانچ بجے جلسے کا آغاز ہوا۔ سامنے اسٹیج پر "لینن" کے قد آور مجسمے کے سامنے رنگ برنگے تازہ پھولوں کی ان گنت ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے قطار میں کرسیاں تھیں۔ جن پر جناب بریژنیف صاحب اور خواتین کمیٹی کی چیئرمین و محترمہ مادام ترشکووا اور دوسری ممبر خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ جلسہ کا آغاز خواتین کی کمیٹی کی چیئرمین نے کیا چونکہ ان کی تقریر کا ترجمہ نہیں تھا۔ لہٰذا کم ہی سمجھ میں آیا البتہ تالیاں بجانے میں سب کا ساتھ ضرور دیتی رہی۔

مادام ترشکووا نے بہت فصیح و بلیغ تقریر کی۔ اس کے بعد چھوٹے چھوٹے بچوں نے مختلف پروگرام پیش کئے۔ ننھے منے لڑکے اور لڑکیاں رنگ برنگے پھول لئے بینڈ کی دھن کے ساتھ سٹیج پر آئے اور اس وسیع ہال میں قطار میں کھڑے ہو گئے۔ سب نے جھک کر اپنی ماؤں کو بہت پیار سے خراجِ تحسین پیش کیا۔

سلاوامام" ۔ یعنی "مائیں زندہ باد"

بچوں کے اس نعرے کو سن کر مجھے اپنی اردو کی پہلی کتاب کی نظم یاد آ گئی۔ غالباً یہ نظم اسمٰعیل میرٹھی نے لکھی تھی۔

؎ مری پیاری اماں مری جان اماں

ہمارے پاکستان میں مغرب زدہ لوگ ماں کو ممی تو کہتے ہیں مگر جو مٹھاس لفظ اماں میں ہے۔ وہ کسی اور لفظ میں نہیں۔ کاکو تو ہمیشہ مجھے امّاں ہی کہتا ہے۔ ایک دفعہ میری سالگرہ پر عشمی نے مبارکباد کی تار بھیجی تو وہاں ہمارے انگریزی دان قسم کے ڈاکخانہ والوں کی سمجھ میں بات نہیں آئی کہ کیا لکھا ہے عبارت تھی۔۔۔۔

امی۔ محبت۔ عشمی۔

بچوں کے بیلے ڈانس کے بعد بچوں نے دلچسپ قسم کے ترانے ماؤں کے اعزاز

میں گاتے ۔ انہوں نے مختلف انداز سے جمناسٹک کے کرتب دکھاتے۔ دو ڈھائی سال کا ایک بچہ ہاتھ میں جھنڈا اُڑاتا ہوا چھوٹے چھوٹے پیارے ساتھیوں کے ساتھ ہال میں داخل ہوا۔ اپنی باریک آوازوں میں سب بچوں نے اس کے ساتھ مل کر بہت پیاری نظم گائی یہاں سب بچے اور بچیاں چار پانچ سال سے لے کر دس بارہ سال کی عمر تک کے تھے۔ اس رنگا رنگ پروگرام کے اختتام پر ان بچوں نے اپنی ماؤں کا شکریہ اس طرح ادا کیا کہ ہر جھنڈے کے اوپر لکھا تھا۔

در سپاسیبا ماما" اماں! شکریہ مرحبا!"

حاضرین کے ساتھ ساتھ بریژنیف صاحب نے بھی جوش و خروش سے تالیاں بجائیں۔ اس مجلس کا پہلا حصّہ ساڑھے چھ بجے ختم۔ اس کے بعد نصف گھنٹہ کا وقفہ ہوا وقفے کے بعد اوپیرا (موسیقی) اور بیلے (رقص ڈرامہ) کا پروگرام ہونا تھا۔ میں اس وقفے کے دوران ڈپٹی چیف آف پروٹوکول کا شکریہ ادا کر کے واپس ہوئی۔ کیونکہ ہمیں آج شب سفارت خانہ اطالیہ میں عشائیہ کے لئے جانا تھا۔ ان صاحب نے مجھے بہت اصرار سے کہا کہ میں اپنی جگہ ریحانہ کو بھجوا دوں تاکہ وہ بھی اس پروگرام سے لطف اندوز ہو سکے۔ سری لنکا کے نائب سفیر کی بیگم ایک ملنسار لڑکی ہے۔ اس نے بھی مجھے کہا کہ رانی بی بی ضرور آئے۔ بارش اور برف باری کے باوجود جلدی جلدی گھر پہنچے میں نے اپنا دعوتی کارڈ رانی کو دے کر باشوئے تھیٹر بھجوایا بعد میں ریحانہ نے بتایا کہ پروگرام قابلِ دید تھا۔

ہاں یاد آیا کہ آج کے دن کی ایک خصوصی رسم یہ بھی ہے کہ عورت کے اعزاز میں سوویت یونین میں اس روز تعطیلِ عام ہوتی ہے۔ دن بھر عورت گھر میں یا گھر کے باہر کوئی کام نہیں کرتی بلکہ میاں، باپ، بیٹے اور بھائی عام دن ان کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں اور تحفے بھی پیش کرتے ہیں۔

اسی شب سفیرِ اطالیہ کی دعوت میں روسی وزارتِ خارجہ کے معزز مہمانِ خصوصی

نے اس دن کے بارے میں ہنستے ہوئے بتایا کہ آپ خواتین کو سال میں چھٹی کا ایک ہی دن ملتا ہے۔ ہم مردوں کے لئے تو ۳۶۴ دن ہیں پھر بھی گویا ؂

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہے۔

○

مکتوب ماسکو
۱۹

ماسکو میں یومِ مئی
پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

۱۴ اگست کی آمد سے تخیل میں سوویت یونین کے یومِ آزادی کا نقشہ پھر سے ابھر آیا، سوچا کہ اس خاکے کو "اخبارِ خواتین" میں کیوں نہ پیش کر دوں۔ سو عرض ہے کہ یکم مئی شب کا یا یوں کہیئے کہ صبح کا ایک بجا چاہتا ہے۔ آج کے اخبار ختم کر کے ۱۷ اسدور الکدر یلیا کے کمرۂ مطالعہ کے دریچے سے جھانک کر دیکھا تو باہر مطلع صاف تھا۔ کل تمام دن برف کے ہلکے چھینٹے پڑتے رہے۔ اور آسمان پر سرمئی بادل چھائے رہے۔ جیسے بوہری بازار میں مقیش کے کاریگر نے سرمئی شیفون پر نقرئی مقیش کے چھینٹے لگا دیئے ہوں۔ لیکن اب بادل چھٹ گئے تھے۔ نیچے پانی کی گاڑیاں فراخ سڑک کی دھلائی کر رہی تھیں۔ اور بجلی کے کھمبوں پر لگے ہوئے سُرخ پرچم ہوا میں لہراتے ہوئے یکم مئی کی آمد کا پتہ دے رہے تھے۔ سامنے کی اونچی عمارت کی کھڑکیوں سے باہر سُرخ پردے لٹک رہے تھے میں نے دل میں سوچا کہ چلیئے یہ اطمینان تو ہوا کہ صبح صبح بارش اور برف باری میں بغیر سائبان کے پریڈ کے میدان میں دو گھنٹے کھڑا نہیں ہونا پڑے گا۔ اہل روس کی قسمت ضرور اچھی سہی لیکن قسمت کی دھوپ بھی اقوام پر یوں ہی پلک جھپکتے نہیں چمکا کرتی۔ اس کے لئے برسوں ریاضت چاہیئے۔ اور صداقت کی کسوٹی۔ ہمارے سفارت خانے کے دائیں طرف کی سرکاری عمارت کے اوپر لینن کی قدآور تصویر مزین ہے۔ اسے دیکھتے ہی یکدم خیال آتا ہے۔ کہ اس ایک دُبلے پتلے انسان نے پوری قوم کی تقدیر بدل ڈالی۔ ویسے سلمان

قوم کو یہ صداقت اور انصاف کا سبق ۱۴ سو سال پہلے ضرور دیا گیا تھا اور بقول شاعر کے

ع ایک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

ہمارے رسول کریم صلعم نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر آئے تھے، اس سبق کو یاد رکھتے ہوئے اسلام کا تمدن وسط ایشیا سے لے کر شمالی افریقہ کے تپتے ہوئے میدانوں اور نصف یورپ کے سبزہ زاروں تک چشم وزن میں پھیل گیا تھا۔ لیکن یہ جو کہتے ہیں۔ ع

یک لحظہ غافل گشتن و صد سالہ منزل دور شد

اب تو یہ نوبت آگئی کہ بقول علامہ اقبالؒ احساس زیاں بھی جاتا رہا۔ کسی قوم کی انتہائی جہالت اور بد قسمتی ہے کہ جب اس کو اپنے نقصان کا احساس بھی نہ ہو۔

ع وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

خیر بات کہاں سے کہاں جا نکلی۔ ذکر آج محنت کشوں کے جشن کا تھا۔ اور اس راجدھانی کی سج دھج کا جو کسی نئی نویلی دلہن کی طرح سرخ آنچل اوڑھے ہاتھوں میں حنا کی تحریر لیئے نظر آرہی ہے۔ گویا

ع پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

صبح جلدی جلدی تیار ہو کر منیر اختر صاحب کی گرم گرم چائے کے گھونٹوں سے کام و زبان جلاتے ہوئے کوٹ پہنا مفلر لپیٹا باہر نکلے تو فضا دھلی دھلی سی تھی۔ تاہم آسمان پر ابر کے چند ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ احتیاطاً رانی بی بی اور غلام حیدر صاحب چھاتا تلاش کرنے لگے۔ اس انتظار میں موٹر میں بیٹھے سجاد جز بز ہوتے رہے۔ بارے چھاتا اور غلام حیدر صاحب سامنے کے دروازے سے نمودار ہو ہی گئے اور ہم لال چوک روانہ ہو گئے۔

راستے میں ایک چوک پر ایک بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "محنت کرنے سے

آج کل سے بہتر ہے اور کل آج سے بہتر ہوگا" برزنیف

سجاد نے اونچی زبان سے جب یہ عبارت پڑھی تو سامنے کی سیٹ پر ہمارے روسی ڈرائیور مسٹر الیکسی بہت لطف اندوز ہوئے اور داد دیتے ہوئے کہا "ہاں محترم جناب سفیر" ان کی انگریزی کی استعداد اس فقرے تک ہے۔ اس سے زیادہ طولانی گفتگو کے لئے ریحانہ بی بی سے مدد لینی پڑتی ہے۔ ۹:۴۰ پر ہم اپنی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہ پریڈ ہر سال لال چوک میں "کریملن محل" کی غربی فصیل کی دیوار کے عقب میں ہوتی ہے۔ اتفاق سے آج میری نظر فصیل کے ساتھ کے سبز ٹاور پر جو پڑی تو معلوم ہوا کہ ٹاور پر لگا یاقوتی ستارہ آہستہ آہستہ لٹو کی طرح گھومتا رہتا ہے۔

پریڈ کا میدان لینن کے مزار کے سامنے ہے اس کی چھت پر جناب برزنیف صاحب اور پولٹ بیورو اور سنٹرل کمیٹی کے سب ارکان کھڑے رہتے ہیں۔ نیچے ان کے بائیں طرف پتھر کی سیڑھیاں جو بتدریج بنی ہوئی ہیں۔ سفارتی نمائندوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ان سیڑھیوں کے بائیں طرف ایک دوسرا اسٹینڈ "سویت یونین" کے وزارتِ خارجہ کے معزز ارکان کے لئے ہے۔ اس کے عقب میں دوسری سمت بین الاقوامی اخباری نمائندوں کی نشست گاہیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح سلسلہ وار سویت یونین کے تماشائی قطار در قطار تاحدِ نگاہ نظر آتے ہیں۔ سب کے سب بازو پر سُرخ ربن باندھے اور ہاتھ میں کاغذ کے سُرخ پھول لئے ہوتے ہیں۔ مئی کا مہینہ شروع ہے لیکن خنکی کی وجہ سے ابھی بازار میں تازہ پھول نہیں آئے۔ اس مئی کے مہینے کی آمد کو ہمارے ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ:-

ع
بہا ہو چوٹی سے ایڑی تک پسینہ

"کریملن ٹاور" کی گھڑی میں ٹھیک دس بجتے ہی جناب برزنیف صاحب مع اپنے پولٹ بیورو کے ارکان کے تشریف لائے اور دائیں بائیں سلام لیتے ہوئے تیزی سے لینن کی آرام گاہ کی سیڑھیاں چڑھ گئے (مغربی پریس کی چہ میگوئیوں کے باوجود نظر بد دور ان کی صحت اچھی خاصی نظر آتی ہے) پورا میدان ان کے خیر مقدم میں ہرے ہرے کے

نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ لیجئے اب یہ تاریخی پریڈ شروع ہوئی۔ پہلے ان سب نے ملکر اپنا قومی گیت گایا۔ آج کی پریڈ میں نہ تو کوئی رسمی تقریب ہوتی ہے۔ اور نہ ہی فوج کا مظاہرہ۔ سوویت یونین کے سب شہریوں کے جلوس باری باری سامنے سے گذرتے رہتے ہیں۔

سب سے پہلے نیلی یونیفارم پہنے کئی سو لڑکے اور سُرخ اور گلابی سکرٹ اور بلاؤز پہنے طالب علم لڑکیاں سُرخ جھنڈے لہراتے ہوئے سامنے سے گذرے۔ اس کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے کئی گروپ مختلف رنگ کے لباس پہنے اور پھول برساتے گذرتے رہے آسمان پر بھی رنگارنگ کے غبارے اُڑ رہے تھے۔ بچوں کے اس سیلِ رواں نے گذرتے ہوئے ماسکو کا لوک گانا گایا۔ میرے قریب ہی جنوبی امریکہ میں "نیزویلا" کے سفیر کھڑے تھے جو یہاں تقریباً ۸ سال سے ہیں۔ "یقیناً آپ اسی روسی گیت کا مطلب جانتے ہوں گے۔ میں نے کہا۔

"بالکل" وہ بولے یہ سفیر صاحب از راہِ کرم میرے لئے اس گیت کا ترجمہ کرتے رہے

"ماسکو! تو مجھے بہت عزیز ہے

"ماسکو! تو بہت خوبصورت ہے

"ماسکو! ....

سفارتی نمائندوں کی برادری بھی ماشاءاللہ رنگارنگ ہوتی ہے۔ مثلاً افریقہ کے نوآزاد ملکوں کے سفیروں کی بیگمات میں ایک تازہ جذبۂ خود اعتمادی نظر آتا ہے صدیوں کی غلامی کے باوجود ان میں احساسِ کمتری نہیں پایا جاتا۔ یہ چیز قابلِ تعریف ہے وہ لباس بھی اکثر بہت قیمتی اور باذوق پہنتی ہیں۔ مثلاً سینی گال کی بیگم سفیر بہت دراز قامت ہیں۔ اس پر فرادر سنجاب کی جھالر لگے فرانسیسی سلے ہوئے لباس میں وہ بے حد باوقار معلوم ہوتی ہیں۔ یوں بھی فرانس اور انگلستان کے کولونیل راج میں یہ نمایاں فرق رہا ہے کہ انگریز جہاں کہیں بھی گئے "بابو لوگ" کی نسل پروان چڑھوائی

اس کے برعکس فرانس کا جھنڈا جہاں جہاں لہرایا وہاں گاؤں گاؤں، قصبے قصبے فرانس کا صحیح قسم کا علم و تمدن پھیلا۔

نائیجریا کے سفیر سید حمزہ کی بیگم آمینہ بہت ہنس مکھ ہیں وہ بھی بہت اونچے قد کی خاتون ہیں اور اپنے لمبے چوڑے افریقی عبایہ اور اونچی ایڑی کے جوتے میں قیامت کے فتنے کو کم کرتی نظر آتی ہیں۔ آج کا نائیجریا تیل کی وجہ سے بہت امیر ملک ہے۔ سو آمینہ بیگم دو چھوٹے بچوں کو آیا کے حوالے کر کے آج ماسکو ہوتی ہیں۔ تو کل ایران یا ترکی اور پرسوں لندن یا پیرس ان کا مذاق اتنا ستھرا ہے کہ وہ اپنے لئے تازہ سلاد اور ٹماٹر بھی لنڈن سے منگواتی ہیں۔ کل ہی پریڈ کے میدان میں ان کا چھوٹا لڑکا آیا کی انگلی چھوڑ کر اماں کی طرف لپکا اس کی اماں فریدہ (لائبریا کی بیگم سفیر) اور ونڈی (جمیکا کی بیگم سفیر) کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھیں۔ میں نے جھک کر آہستہ سے کہا کہ "آمینہ تمہارا بیٹا ماشاء اللہ بہت ذہین ہے کہ یہ اب بھی تم کو پہچانتا ہے۔" ونڈی اور ان کے میاں سفیر جمیکا کو ہمارے ہاں یوم اقبالؒ میں آکر علامہ اقبالؒ کے حالات زندگی پڑھنے کا بہت شوق ہوا گذشتہ ہفتے ہمارے ہاں آئیں تو ان کو میں نے انگریزی میں علامہؒ پر ایک کتاب دی۔ کل انہوں نے بتایا کہ "وہ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ میں اسلام کی پوری تاریخ اب پڑھنا شروع کر رہی ہوں۔ چونکہ اقبالؒ کا کلام سمجھنے کے لئے اسلام کا پوراپس منظر جاننا بہت ضروری ہے۔"

میری ہی قطار میں سنگاپور کے سفیر اور ان کے بازو میں سفیر ہند بیٹھے تھے پریڈ شروع ہونے سے چند منٹ پہلے سفیر افغانستان آئے۔ اکثر سفیروں کا قیاس تھا کہ ان کے ہاں جو پرسوں انقلاب آیا ہے اس کی وجہ سے غالباً وہ شریک نہ ہوں۔ لیکن افغان ایک بہت بہادر قوم ہے۔ میں ان کی مردانگی کی پوری داد دیتی ہوں کہ وہ آئے اور اسی ٹھہرے ہوئے انداز کے ساتھ نہ ماتھے پر شکن نہ آواز بجھی بجھی سی اور یہ جو ہم ٹھہرے خانہ بدوش۔ ان کی بھی زندگی کا ایک عجیب ضابطہ ہے۔ بقول حضرت پطرس

دل میں کچھ بھی ہو آپ سدا مسکراتے رہیے۔ لیکن پھر بھی چند ایسے سخت مرحلے آجاتے ہیں کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کسی صاحب کا خیال یقیناً غلط ہے۔ کہ "اچھا سفیر وہ ہے جو بہت خوبصورتی سے جھوٹ بولے"۔ آپ کا سفارت خانہ تو آپ کے ملک کی بیرونی کھڑکی ہے اگر مال کھرا ہو گا تو اس کا عکس بھی ویسا ہی اُجلا نظر آئے گا۔ البتہ ایک سفیر کا کام خوب سے خوب تر بنانا ضرور ہے۔ ایک سفیر بے تقصیر نہ تو کوئی شعبدہ باز ہے۔ یا جادوگر کہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا دے۔

"آج کیا اچھا موسم ہے۔ سنگاپور کے سفیر جلدی سے کھڑے ہو کر افغانستان کے سفیر سے مخاطب ہو کر بولے وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ البتہ سفیر ہند نے جلدی سے اور بڑی گرمجوشی سے ان سے رازدرانہ روش میں گفتگو شروع کر دی اور بہت دیر تک کرتے رہے۔ میں نے موقع پا کر صرف اتنا ہی فارسی میں کہا کہ والدہ لیلیٰ خانم کیسی ہیں ؟ اور اُمید ہے کہ کابل میں سب کے سب عزیز بخیریت ہوں گے۔ جس کا جواب انہوں نے شکریہ اور اثبات میں دیا۔ افغانستان ہمارا عزیز ہمسایہ ملک ہے۔ ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات لازمی ہیں۔

پریڈ کے میدان میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کھیلوں کی مختلف وردیاں پہنے اور ان پر میڈل سلجائے لینن کی ایک بہت بڑی تصویر اٹھائے آئے۔ سرخ سائن سے بنی ہوئی قدآور سہ طرفی قسم کی تصویر دونوں رخ سے ایک جیسی معلوم ہوتی تھی لینن اپنی ٹوپی کو مخصوص طرح سے جھکا کر حاضرین کو سلام کرتے نظر آرہے تھے مجھے اس تصویر کو دیکھ کر شیخ سعدیؒ کا وہ مشہور مصرعہ یاد آ گیا ؎

تو کجا بہر بے تماشا میروی ؟

یہاں تو ملک کا ملک اپنے معمار کا دیوانہ ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ کہ ان کے اس لیڈر نے غریب محنت کشوں کو زاروں کے ظلم و ستم سے نجات دلوا کر ستاروں تک پہنچا دیا۔ اسلام نے امیر و غریب اور رنگ و نسل کا امتیاز مٹا کر محمود و ایاز دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا تو کیا لیکن ہم تو یہ چلن بھول گئے اسے اغیار نے اپنا لیا جبھی تو اقبال نے شکایت کی

ع تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

جلوس کا سلسلہ تو بہت لمبا تھا۔ ہم لوگ ۱۲ بجے واپس گھر لوٹے۔ کریملن کے عقبی باغ کے قریب گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہاں تک جاتے ہوئے راستے میں ہنستے کھیلتے مرد و زن کا ایک دریا موجزن نظر آیا جو کہ ماسکو دریا کی لہروں سے کم جوشیلا نہیں تھا۔ باپ بچوں کو کاندھوں پر بٹھائے ہوئے اور بچوں کی اونی ٹوپیوں کے سرخ اور نیلے پھندنے اور ان کے ہاتھوں میں سرخ سبز اژدھے، نیلے غبارے ہوا میں لہراتے ہوئے۔ لڑکیوں نے پھولوں کی چھڑیاں تھامی ہوئیں۔ ریحانہ نے ہماری توجہ گزرتے ہوئے جلوس کے ایک پوسٹر کی طرف دلوائی۔ اس پہ ایک عرب کی تصویر تھی۔ نیچے لکھا ہوا تھا۔ سرمایہ دار طاقتوں کے ظلم عربوں پر۔ یہ چیز اس دفعہ نئی تھی، پہلے کبھی نہ دیکھی۔ یوں بھی یہاں فلسطین کے نمائندے کو باقاعدہ سفیر کا درجہ دیا گیا ہے۔

کریملن پارک کے عین سامنے اونچے اونچے دروازے کی ایک قدیم عمارت ہے سجاد نے بتایا کہ یہ زار بادشاہوں کا شاہی اصطبل تھا۔ گھر گئے تو باہر کی سڑک پر میلے جیسی رونق دیکھی اور اہل ماسکو کے چہروں پر عید جیسی شگفتگی۔ رات کو شہر بھر میں چراغاں ہوا اور آتش بازی کے سرخ، سبز، سنہری روپہلی اور لاجوردی روشنیوں سے عالم تمام مطلع انوار ہو گیا۔ یوں کہیئے کہ جیسے کسی نے گہرے نیلے آسمان سے سچے موتیوں کے تھال کے تھال الٹ دیئے ہوں۔ گذشتہ سال ہما مسعود بتا رہی تھیں کہ دریا پہ سے یہ روشنی بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔

۲ مئی:۔ آج صبح ۱۱ بجے سے ایک بجے دوپہر تک ہمارے سامنے کی سڑک ٹریفک کے لیے بند رہی۔ اس کھلی چوڑی سڑک پہ پیارے پیارے ننھے بچوں کی دوڑ سے کافی چہل پہل نظر آئی۔ بچے اپنے اپنے مدرسے کی یونیفارم اور اپنا اپنا نشان لیے ہوئے دوسری طرف پولیس اور ریڈ کراس کی چار موٹریں بچوں کے ساتھ احتیاطاً ایک طرف

آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ تماشائی شوقین میلے کے سڑک کے دونوں طرف کھڑے دیکھ ضرور رہے تھے۔ مگر بچوں کی توجہ مبذول کرنے کے لئے بیکار کا شور نہیں مچا رہے تھے جیسے ہی کھیلیں ختم ہوئیں۔ ابرِ خوش ہنگام نے چھم چھم برسنا شروع کر دیا۔ اب سہ پہر کو بہت سے بچے اپنے والدین کے ساتھ سرکس یا گورکی پارک جائیں گے۔ سردی ہو یا گرمی گورکی پارک میں ہر وقت بچوں کے لئے مختلف کھیلیں اور تفریح کا سامان مہیا رہتا ہے یہ پارک سعد میاں کو بھی پسند ہے۔ کرسمس کی چھٹیوں میں وہاں برف پر اسکیٹنگ کے لئے بچے گئے تھے۔ موسم سرما میں وہاں برف پر ہاکی بھی کھیلی جاتی ہے مگر اب تو آمد بہار ہے۔

ع صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے۔

○

محنت کی بدولت آج، کل سے بہتر اور کل آج سے بہتر ہوگا۔ (ابریزنیف)



ماسکو کی مسجد میں عید میلاد النبیؐ کے موقع پر ایک اجتماع



حضرت مولانا یعقوب چرخی ؒ کے مزار مبارک کے متولی اپنے خاندان کے ہمراہ

مکتوب ماسکو

۲۰

ماسکو میں عیدِ سعید

ہم نے یالٹا کے تاریخی آثار کی سیر کی

*

۳ ستمبر: آج ماسکو میں عیدِ سعید ہے اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ محترم حکیم محمد سعید بھی آج غریب خانہ پر تشریف رکھتے ہیں۔ آپ کل ہی شام فن لینڈ میں طبّی کانفرنس میں شرکت کے بعد آئے ہیں۔ ان کی آمد سے یہ عید مزید سعید ہوگئی۔

صبح ہی صبح سات بجے حکیم صاحب، سجاد، سعد میاں، غلام حیدر، منیر اختر اور دفتر سے خان محمد گارڈ، ماسکو شہر کی مسجد میں نماز کے لئے گئے۔ یہ تاتاریوں کی مسجد ہے اور عید کے روز یہاں نمازیوں کا اژدہام دیکھ کر ایک رُوحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہی تاتاری ہیں، جن کے آباؤ اجداد کو خطاب کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کس قدر سادگی اور دلکشی سے ایک پوری تاریخ کی داستان اختصار سے ایک مصرع میں بیان کر دی کہ ؎

"پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"

نماز کے بعد خطبہ عربی اور تاتاری دونوں زبانوں میں دیا جاتا ہے۔ اپنے ہم مذہبوں کو کثیر تعداد میں دیکھ کر حکیم صاحب کو بھی تعجب آمیز خوشی ہوئی۔

نماز کے بعد گھر آکر کچھ دیر چائے، شربت اور شیر خرما کا دلچسپ شغل رہا۔ شربت بھی منیر نے خانۂ باغ کے سیبوں کا تازہ کشید کیا تھا۔ مختصر یہ کہ خانۂ باغ میں سیب کے دو درخت ہیں۔ کراچی سے رشید بھائی نے سجاد کے ہاتھ جوامرنیان اور برفی بھیجی تھی

وہ بھی فریج میں محفوظ تھیں۔ آج دسترخوان کی زینت بنیں۔

گیارہ بجے جناب فاروق شہابا نائب سفیر مصر کے ہاں عید ملاقات کا بلاوا تھا۔ جناب حکیم صاحب کے ساتھ وہاں گئے۔ وہاں مراکش، عراق اور بنگلہ دیش کے سفیر اور نائب سفیر بھی مدعو تھے۔ مصر کی عائیدہ فاروق بہت ملنسار خاتون ہیں۔ ان کی بیٹی بھی بہت پیاری بچّی ہے۔ ہمارے ہاں کل عید کی دعوت ہے۔ جس میں بچے مہمان خصوصی ہوں گے اور طلباء کے لئے بھی بُلاوا ہے۔

مَیں نے خورشید بنگلہ دیش کے نائب سفیر سے کہا کہ آپ بھی ہمارے ہاں اپنے بچوں کو لے کر ضرور آئیے۔ ان کے دو بیٹے عمر اور عدنان چار اور چھ سال کے ہیں۔ مسز خورشید آج کل ہاورڈ یونیورسٹی بوسٹن میں ہیں۔ اب تو بنگلہ دیش بنے کچھ عرصہ ہو گیا۔ لیکن اب بھی جب ان پرانے ہم وطنوں سے ملئے تو ویسی ہی اپنائیت محسوس ہوتی ہے اور سچ پوچھئے تو ان کے بنا ہماری محفل سونی سی معلوم ہوتی ہیں۔

کل شام آٹھ بجے سجاد، رانی، سعد میاں اور میں کریمیا، سوچی SOCHI تبلسی TIBLISI اور باکو (آذربائیجان) میں نو دن گزار کر آئے۔ سجاد اور میں تو جارجیا اور باکو پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اب سوچا کہ لندن سے سعد چھٹیوں میں آیا ہوا ہے۔ سو ان کی اور ریحانہ بی بی کی معلومات میں کچھ اضافہ ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے کہ بقول غالبؔ ؎

بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

کریمیا کے جزیرہ نما میں "یالٹا" کا خوبصورت سرسبز شہر بین بحیرۂ اسود کے کنارے واقع ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ترکیہ خلافت کے عروج کے زمانے میں اسے ترکی کی جھیل کہا جاتا تھا۔ اس کے آس پاس بلکہ چاروں طرف کا علاقہ ترک حکومت کے زیرِ نگین تھا جب اس عالیشان سلطنت کا زوال ہوا تو یہ سب علاقے ان کے احاطۂ اختیار سے

سے نکل گئے۔ اسی ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھے بیٹھے تخیل کے سہارے سلطان سلیم اور سلطان سلیمان کی فوج ظفر موج کی یلغار اور مؤذن کی اذانوں کی مقدس آواز۔ کارواں سراؤں میں گھوڑوں کی ٹاپ اور اونٹوں کی گھنٹیاں، حرم سرائے کے حریر وابریشم کے پردوں سے جھانکتی ہوئی شہزادیاں اور ان کے صحنِ چمن میں ساز بجاتی ہوئی مغنیہ، رقص کناں طاؤس کے پائل کی جھنکار۔ دھیرے دھیرے یہ تصاویر اک سماں باندھتی رہیں۔ اور نیچے بحرِ اسود کے پانی کی لہریں تھم تھم کر ابھرتی اور سمٹتی رہیں۔ جیسے وہ بھی کسی طلسم میں مسحور ہوں ... وہ جو فلسفۂ اقبالؒ کے اس شعر میں مستور ہے۔ وہ دراصل ایک حقیقت ہے۔ ہسپانیہ میں عربوں کی حکومت، خلافتِ عثمانیہ اور ہندوستان میں عظیم سلطنتِ مغلیہ ان سب پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

ترکوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر ملکہ کیتھرائن دوم زارینہ نے کریمیا فتح کر لیا اور یہ گرم پانی کا سمندر روس کی عملداری میں آگیا۔ اس سمندر کی قربت سے موسمِ سرما میں بھی یہاں کا موسم نرم و گرم رہتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کا صلح نامہ کی مشہور تاریخی کانفرنس جس میں پریذیڈنٹ روزویلٹ اسٹالن اور چرچل شریک ہوئے۔ یہیں ایک محل میں منعقد ہوئی تھی۔ اٹھارویں صدی کا بنا ہوا زار کا یہ محل بھی دیکھا اور اس کا کانفرنس ہال بھی جو زار کا کمرۂ طعام تھا۔ سرو و صنوبر چنار سے گھرے ہوئے چمن میں یہ خوبصورت محل ماضی و حال کا ترجمان ہے۔

ہم ایک جدید ہوٹل میں ٹھہرے، جس کا نام روسی زبان میں 'موتی' ہے اور واقعی سمندر کے گہرے نیلے پانی کے کنارے کنارے کریمیا کے روشن اور گرم آفتاب کی کرنوں کی ضو میں یہ ایک جھل مل جھل مل کرتا ہوا صاف اور شفاف موتی ہی معلوم ہوتا ہے اس بہت بڑے ہوٹل میں رہائش کے ایک ہزار سے زیادہ کمرے ہیں۔ آج کا

یالٹا ایک بہت اہم صحت افزا مقام ہے۔ یہاں متعدد صحت گاہیں اور عوام کے تفریح و آرام کے لئے ہوسٹل بنے ہیں جن میں سوویت یونین کے سبھی باشندے تقریباً مفت علاج اور آرام کے لئے سال میں ایک ماہ کے لئے چھٹی پر آسکتے ہیں۔ لینن نے ۱۹۱۹ء میں قانون بنایا تھا کہ کریمیا کے تمام قدیم شہزادوں کے محلات اور رؤساء کی حویلیاں۔ باغات۔ تفریح گاہیں وغیرہ مزدوروں اور کاریگروں کے لئے وقف کر دی جائیں۔ اس اصول پر آج بھی پابندی سے عمل ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے سفارت خانے کی خادمہ آنیتا جو ایک بہت شفیق خاتون ہے۔ گذشتہ سال یہاں کی ایک صحت افزا رہائش گاہ میں اپنی سالانہ چھٹی کے ایک ماہ گزار کر آئی۔ وہاں کا رہنا سہنا۔ کھانا۔ علاج اور تفریح سب مفت اور وہاں کی آب و ہوا کی سہائی حسین پس منظر، سمندر اور پہاڑوں کا دل آویز جوڑ۔ یہ سب کچھ الگ بلا دام۔ ایسی ہی ایک صحت بنانے والی رہائش گاہ ہم نے بھی دیکھی۔ جس میں سمندر کے پانی سے علاج کیا جاتا ہے اور زیر زمیں پمپ لگا کر گندھک کے چشموں سے بھی۔

یالٹا کے قریب چند میل کے فاصلہ پر بچّوں کا ایک وسیع کیمپ ہے جس میں ایک وقت میں پانچ ہزار بچے ٹھہرتے ہیں۔ یہاں دنیا بھر سے بچّے آتے ہیں۔ دو سال ہوئے پاکستان سے بھی چھوٹے بچّے آئے تھے اور سُنا ہے بہت خوش واپس گئے۔

ائیرپورٹ کو جاتے ہوئے ایک تاتاری خان کا محل "بخشی سرائے" ہے۔ اس محل کو دیکھ کر مشہور روسی شاعر نے اپنی شہرۂ آفاق نظم بخشی سرائے لکھی تھی جو ایک شہزادی دل آرا کے متعلق ہے۔ اس تاریخی محل کا ذکر انشاء اللہ آئندہ خط میں سہی۔ تاتار کریمیا میں چودھویں صدی کے آخر میں آئے اور بہت شان سے حکومت کرتے رہے۔ غرضیکہ تاریخی نقطۂ نظر سے اور قدرتی مناظر کی بنا پر گوناگوں رنگ آمیزی کے لحاظ سے بھی یالٹا ایک بہت دلچسپ مقام ہے۔ جی چاہتا رہا کہ اس سکون آفرین فضا میں اور رہیں اس کی اُجلی اُجلی نِتھری گھاٹیاں نیچے سمندر کا گہرا نیلم جیسا پانی اور تاحدِ نظر سبزہ، پھول اور پھلدار درخت اور ان سب کو دامن میں گھیرے ہوئے اونچے اونچے

پہاڑ، سرسبز و شاداب، یعنی پہاڑ بھی وہ جنہیں کوہ قاف کہتے ہیں۔
بچپن میں کوہ قاف کا تصوّر ہمارے لئے پرستان سے کم نہ تھا۔ اور کوہ قاف کی پری تو گویا حسن و جمال کے پیکر کا نام ہوتی۔

یہاں تین دن ٹھہر کر ہم پانی کے جہاز "جورجیا" نامی سے سوچی گئے۔ اس شہر کا حال انشاء اللہ آئندہ سہی۔ آج تو بس چند سطور جلدی جلدی لکھ رہی ہوں۔ یوں کہ جناب حکیم صاحب آج ہی شب عازمِ کراچی ہیں۔ تاکہ پاکستان میں عید مناسکیں ورنہ ہم تو بہت چاہتے رہے کہ وہ کچھ دن قیام کرتے۔ یہ خط انہی کے ہاتھ بھیج رہی ہوں۔ حکیم صاحب محترم کی عنایت سے یہ خط آپ کو جلد مل جائے گا۔ بھلا ایسے مشہور قاصد کب کب ملتے ہیں۔

○

مکتوب ماسکو

۲۱

ماسکو کے نواح میں اولمپک گاؤں بسایا جائیگا

مرزا غالب نے مدت ہوئی کہا تھا ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

یہ نقطہ نگاہ مرزا غالب کا تھی، لیکن زمانۂ دراز سے یونان میں اولمپک کھیلیں ہر سال کھیلی جاتی تھیں۔ قدیم یونان میں علم و فن کی دیگر خصوصیات کے ساتھ یہ ایک امتیاز مزید شامل تھا۔

گزشتہ سال ماسکو میں اسپین کے سفیر اپنے یہاں کی خانہ جنگی کے بعد پہلی دفعہ مقرر ہوئے ہیں۔ اب تک ماسکو میں اسپین کا صرف تجارتی نمائندہ کام کرتا تھا اسپین کے نئے سفیر کا نام جناب مسٹر جان انتھنیو ہے۔ ان کو ماسکو آئے ہوئے تقریباً ایک برس ہوا ہے۔ نہایت خلیق اور باذوق انسان ہیں۔ ان کی بیگم بھی بیحد حسین ہیں اور لباس کا بہت اعلیٰ مذاق رکھتی ہیں۔ سفارتی ذمہ داری کے ساتھ وہ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے وائس پریذیڈنٹ بھی ہیں۔ اس لیئے ہمیں ان سے وقتاً فوقتاً ۱۹۸۰ میں ہونے والی اولمپک کے بارے میں چند دلچسپ معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ میری آج کی تحریر انہی کے خیالات کا خلاصہ سمجھیئے۔ بقول ہسپانوی سفیر کے گزشتہ چند ماہ سے سوویت یونین کے

تمام بڑے بڑے شہروں مثلاً مالن کیو، لینن گراڈ منسک میں غیر معمولی رونق نظر آتی ہے۔ وہ یوں کہ ان شہروں میں ہر قسم کے ہر ملک اور ہر نسل کے کھیلوں کے فن کے ماہرین جوق در جوق نظر آتے ہیں۔ گویا کھیل سازوں کی یہ ایک نوخیز نسل ہے۔ ان سیاحوں سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہے جو کہ اکثر سوویت یونین کے بڑے شہروں میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے عجائب گھروں کو جھانکتے نظر آتے ہیں۔ اور نہ ہی ان کا رشتہ تاجر طبقے سے ہے۔ جو اس بڑے ملک میں آئے دن دوسرے ممالک سے مختلف تجارتی کانفرنسوں اور سیمناروں میں حصہ لینے کے لئے آتے ہیں۔

کھیل کے میدان کے ماہرین کا یہ نیا طبقہ جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ اپنے ہاتھ میں نوٹ بک اور قلم تھامے ان سب شہروں کو اس نقطۂ نگاہ سے ناپتا نظر آتا ہے۔ کہ یہ مقام ان کھیلوں کے لئے اور اپنے کھلاڑیوں کے لئے کس حد تک موزوں ہے۔ یہ لوگ اولمپک کمیٹی کی بین الاقوامی فیڈریشن کے ممبر ہیں جو کہ ۱۳۳ ملکوں سے منتخب ہوئے۔ گویا کہ یہ ۱۳۳ ملکوں کی المپک کمیٹی کی انتظامیہ کے ممبر ہیں۔ یہ ماسکو اور سوویت یونین کے دوسرے شہروں میں کھیل کود کی فضاؤں کی نبض ٹٹولنے آئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کی دلچسپی کھیل کے اسٹیڈیم کی تکنیک تک ہی ہے۔ چند دوسروں کو پیراکی کے تالابوں کی گہرائی اور پانی کے درجۂ حرارت معلوم کرنا ہے۔ تیسرا گروپ یہ جاننا چاہتا ہے۔ کہ ان شہروں میں ان کے کھلاڑیوں کی جائے رہائش کیسی ہوگی اور ان کے ہاں کے صحافیوں ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندوں کو کہاں ٹھہرایا جائے گا۔ ان کا مقصد یہ بھی معلوم کرنا ہے۔ کہ اولمپک گاؤں سے کھیل کے میدانوں تک کیا مسافت ہوگی آنے جانے کے وسائل کیا ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ ان تمام شہروں کے مختلف ہوٹلوں کے روسی کھانوں کا ذائقہ چکھ کر محسوس کرنا چاہتے ہیں کہ کیا خورد و نوش کے یہ سامان ان کے ہاں کے کھلاڑیوں کے لئے صحت مند ثابت ہوں گے

اور انہیں یہ کھانے پسند بھی آئیں گے۔

آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اس تمام غور و فکر کا لب لباب یہ ہے کہ تمام بین الاقوامی کھلاڑیوں کو یہاں آکر گھر کا سا ماحول میسر ہو اور وہ ایک آرام دہ فضا میں اطمینان سے کھیل کر اپنے اپنے فن کے جوہر دکھا سکیں۔ کھلاڑیوں کے آرام اور خوراک کو مد نظر رکھنے کے بعد انٹرنیشنل فیڈریشن کو یہ بھی جانچنا ہے۔ کہ کس نئی تکنیک سے کام لے کر ان کے کھلاڑی یہاں آکر زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

موجودہ سائنٹفک تحقیق سے ذرا ذرا سی بات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ کہ چھوٹی چھوٹی خامیوں کو نظر انداز کرنے سے مستقبل میں بازی اکثر ہارنی پڑتی ہے۔ یہی خامیاں اگر روزِ اوّل درست کر دی جائیں تو فتح کو پالینا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ ان تمام اصولوں کو پرکھنے کے بعد یہ سب لوگ اپنے ملک کے کھلاڑیوں کو بتا سکیں گے کہ وہ کن کن چیزوں سے لیس ہو کر جولائی ۱۹۸۰ء میں ماسکو پہنچیں ماہرین یہ بھی اندازہ لگائیں گے۔ کہ جولائی ۱۹۸۰ء میں یہاں موسم کیسا ہوگا۔ تفریح اور کھانے پینے کو کیا کیا ملے گا۔

اولمپک کے ان منتظمین اور کھیلوں کے ماہرین کے آنے سے سوویت یونین کے دارالحکومت نے ایک خوبصورت رُخ اختیار کیا ہے۔ اور ایک قسم کی بشاشت ماسکو کے گرد و نواح میں آمدِ بہار کے ساتھ ساتھ پھوٹی پڑتی ہے، گویا ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

جیسا کہ میں نے پہلے کئی بار عرض کیا ہے۔ یہاں لوگوں کو بچوں کے ساتھ دلی لگاؤ ہے۔ اور ان کے کھیلوں میں خصوصاً بہت دلچسپی لی جاتی ہے۔ کھیلتے کودتے ہنستے ہوئے تندرست بچے ہر ملک کی زینت ہوتے ہیں۔ سردی اور گرمی میں یہاں کے کھلاڑی شہریوں کے لئے ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہتے ہیں۔ برفباری

کے زمانے میں جب کہ ماسکو کے کوچہ و بازار اک روائے برف میں ملفوف نظر آتے ہیں۔ یہ کھلاڑی سب سے بہترتک مختلف رنگوں کے لباس پہنے دریائے ماسکو کے کنارے صبح و شام دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں اور شہر کی سنجیدہ فضا کو ایک شگفتہ توانائی بخشتے ہیں۔ یا پھر شہر کے آس پاس کے جنگلوں میں برف پر اسکیٹنگ کرتے نظر آتے ہیں۔

جب ماسکو میں موسم بہاراں آتا ہے۔ تو بیرونِ شہر کے جنگلات اور شہر کے اندر باغات برف کی بوجھل چادر کو الٹ کر ایک دم سے یوں سرسبز ہو جاتے ہیں جیسے سبز پریاں کسی پرستان سے چشم زدن میں پہنچیں اس وقت ان رنگ برنگے گلفام کھلاڑیوں سے فضا اور بھی دھنک کے رنگوں میں رنگی جاتی ہے۔

خصوصاً جولائی ۱۹۸۰ء میں مختلف ملکوں کے آئے ہوئے کھلاڑی اپنے اپنے مخصوص رنگ کے لباس پہنے اور اپنا اپنا پرچم ہاتھوں میں بہت شان سے تھامے ماسکو کو اور بھی رنگینی اور وقار بخشیں گے۔ سالِ آئندہ کے موسمِ گرما میں ماسکو میں سوشلسٹ ملکوں کی ساتویں ٹورنامنٹ ہوگی۔ یہ ایک قسم کی ۱۹۸۰ء کے "اولمپک" کے لئے ڈریس ریہرسل ہوگی۔ یعنی اصل کھیل سے پہلے آخری مشق۔

آج کل سوویت یونین کی کھیلوں کی میزبان کمیٹی ہر ممکن طریقے سے "اولمپک" ۱۹۸۰ء کو کامیاب بنانے میں شب و روز مصروف ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے موجودہ ایئرپورٹ کے ساتھ ایک "نیا ایئرپورٹ" اولمپک ۸۰ء کے مہمانوں کے لئے تیار ہو چکا ہے۔ جو کہ کھیلوں میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں اور دوسرے شائقین اولمپک کی آمد و رفت کے لئے مخصوص ہوگا۔ کئی خوبصورت نئے نئے ہوٹل سیاحوں کے لئے تعمیر ہو رہے ہیں۔ ہماری سڑک سدووا سے ذرا آگے جائیں تو ماسکو دریا کے بائیں کنارے انٹرنیشنل پریس کے نمائندوں کے لئے ایک عظیم الشان عمارت تقریباً تیار ہو چکی ہے۔ جس میں ۸۰ء کے کھیلوں کا جائزہ لینے والے اخبار رسالے ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندے کام کریں گے

گزشتہ اتوار سعد میاں کو ہم "اولمپک" کا زیر تعمیر گاؤں دکھانے لے گئے۔ شہر سے چند میل کی مسافت پر ایسے دو چار گاؤں زیر تعمیر ہیں۔ کھیلوں کے لئے ماسکو کے موجودہ اسٹیڈیم کے علاوہ ایک بہت بڑا نیا اسٹیڈیم بھی تعمیر کیا جا رہا ہے۔ واپسی میں لینن، کی پہاڑیوں سے آتے ہوئے ہمارے ڈرائیور مسٹر والکوف نے دریا کے اس پار ایک نیا بنا ہوا تیراکی کا تالاب بھی دکھایا جو کہ کنول نما ہے کھلاڑیوں کے ہر گاؤں میں ان کے خورد و نوش کے لئے "کیفی ٹیریا" اور تفریح کے لئے سینما، تھیٹر، تیراکی کے تالاب اور خرید و فروخت کے لئے دوکانیں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ گویا ان کی اپنی ایک دنیا ہو گی۔ تالن میں چونکہ کشتی رانی اور تیراکی کے مقابلے ہوں گے۔ اس لئے وہاں بھی یہ سب نئی عمارتیں بنائی جا رہی ہیں۔ کیو اور لینن گراڈ میں بھی اسی سلسلے میں نئی عمارات تعمیر کی جا رہی ہیں۔

ماسکو کی سڑکیں پہلے ہی بہت فراخ ہیں۔ لیکن کہیں ان کو اور بھی فراخ دل بنایا جائے گا۔ ابھی گزشتہ ماہ ماسکو میں اسپورٹس کی چیزوں کی ایک نمائش ہوئی جس میں فٹ بال سے کراس کی اِنگ (برف کے کھیل) کے جوتے تک موجود تھے۔ روسی ساخت کا ہر قسم کے کھیل کا سامان اور کھلاڑیوں کے لباس برائے نمائش رکھا تھا۔

۱۹۸۰ء ابھی دور ہے۔ تاہم دوکانوں میں جا بجا اولمپک کے نشان کے سفری تھیلے، ہینڈ بیگ، رومال، ٹوپیاں، سویٹر، ٹائیاں، قمیضیں وغیرہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ تالن سے رانی نے بھی گزشتہ سال ایک خوبصورت سا سبز چرمی تھیلا خریدا تھا۔ جس پر تالن لکھا ہوا ہے اور اولمپک کا نشان ہے۔ حسنِ اتفاق سے یہی تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا جب ہم گزشتہ دسمبر بوسٹن (امریکہ) کی ایک بڑی دکان میں شاپنگ کر رہے تھے۔ خرید و فروخت کرتے ہوئے یہ عام کمزوری ہے کہ انسان بٹوے میں اپنی رقم بھول جاتا ہے۔ "کاونٹر" پر بل دیتے ہوئے

دیکھا تو پیسے کچھ کم تھے۔ ہم طارق میاں کا لکھا ہوا چیک دینے لگے تو کاؤنٹر والی لڑکی نے کہا کہ ہم خریدار کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا چیک وصول نہیں کرتے جب ہم نے ان کو بتایا کہ ہم ماسکو سے آئے ہیں۔ اس لئے ہمارا حساب یہاں نہیں ہے تو پاسپورٹ دکھانے کی نوبت یوں نہ آئی کہ خوش قسمتی سے اس لڑکی کی نظر رانی کے اسی تھیلے پر فوراً جا پڑی۔ وہ لڑکی یکدم شگفتہ سی ہو کر بولی کہ "یہ سفید تھیلا تو تالن کا ہے"، "میں بھی گزشتہ سال وہاں سیر کے لئے گئی تھی۔ کس قدر خوبصورت جگہ ہے۔"

اس خوش کن تاثر کے ساتھ ہی اس نے طارق میاں کا چیک بھی خوشی سے قبول کر لیا۔ اولمپک کھیلیں ماسکو کے علاوہ یہاں کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی کھیلی جائیں گی۔ خدا کرے کہ ہماری ٹیم یہاں آ کر کامیاب ثابت ہو اور ہمارا چاند ستارے والا سبز پرچم ہمیشہ سرفراز رہے۔

یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کی خدمت میں آنے والی اولمپک کی ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر بہت بلند ہے۔ اور بہت سی بلندیوں کا پیام دیتا ہے۔ تاہم اسے اپنی تائید میں عرض خدمت کرنا میرے لئے باعث اقبال ہو گا۔

کھول کر آنکھیں میرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

○

مکتوب ماسکو

۲۲

بہاروں کی یاد !

لینن کا یوم پیدائش

ع پھر بہاروں کی یاد آئی ہے، اوڑھ کر چادرِ نسیم بہار

(جوش ملیح آبادی)

حسنِ خیال سہی لیکن آج صبح ہی صبح دریچے سے جھانکا تو سیب کے ان دو درختوں کی شاخوں پر، جو ہمارے گھر اور دفتر کے درمیان کے آنگن میں دو مستعد سنتریوں کا کام دیتے ہیں، ہری ہری ننھی ننھی پتیاں لرزاں لرزاں نظر آئیں۔ جیسے کسی مشّاق زنگریز نے رات ہی رات خشک لکڑیوں پر پیالے میں زمردیں رنگ گھول کر اپنے قلم جادو رقم سے چند چھینٹے اُڑا دیئے ہوں۔ ماسکو کی دوشیزہ بہار اپنی بوجھل برفیلی ردا کو ایک ادائے کافرانہ سے جھٹک کر منظرِ عام میں آنے کو پر تول رہی ہے اور کچھ ہی دنوں میں سبز پوش بھی لبِ بام نظر آجائے گی۔

۲۰ر اپریل کو سفارت خانہ انڈونیشیا میں ہیروئین ڈے، تھا۔ ان کی ایک مشہور قومی خاتون کی یاد میں ہر سال یہ تقریب منائی جاتی ہے۔ باتیک کی چیزوں کی نمائش بھی تھی۔ اور انڈونیشیا کی شادی کے مناظر بھی بہت دلچسپ طریقے سے رقص و سرود کے ساتھ پیش کیے گئے۔ اسی پروگرام میں ان کے ہاں کے تمام علاقائی لباس بھی نظر آئے۔ جن میں چند ایک ہمارے ہاں کے پنجابی شلوار اور قمیص اور حیدر آباد دکن کے کرتے اور پاجامے سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ سر پر پہننے کی چند ٹوپیاں اور رومال کچھ ولندیزی طرز کے

معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں ہسپانوی سج دھج بھی تھی۔ ان کے ہاں شادی میں خالص اسلامی رسوم کے ساتھ ساتھ چند مخصوص معاشی رسوم بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کا تعلق غالباً ان کی تہذیب قبل از اسلام سے ہے۔ مثلاً ان میں ایک تو یہ ہے کہ دولہا اور دلہن ساس سسر اور والد والدہ کے پاؤں کو احتراماً چھوتے ہیں۔ اسلام نے اس حد تک تو سر کو جھکانا نہیں سکھایا۔ اس کے علاوہ دولہا کمرے کے اندر آ کر ایک کچے انڈے کو پاؤں سے توڑتا ہے اور پھر دلہن دولہا کے پاؤں کو بڑے ادب سے دھلاتی ہے۔ ملائیشیا کے سفیر مسٹر زین العابدین اس تقریب سے ایک روز پہلے ہمارے ہاں ملنے آئیں۔ ان سے ان کے ہاں کی عروسی کی رسموں پر تبصرہ رہا۔ اس سلسلہ میں میں نے ان سے کہا کہ انڈونیشیا میں یہ رسم تو غالباً ہندو تہذیب کے زیر اثر ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ ان کے ہاں یوں نہیں ہوتا۔ ویسے ہم میں بھی (یعنی پاکستان میں) ہندو تمدن کی وجہ سے شادی بیاہ کے سلسلہ میں کافی بے کار کی رسمیں ابھی تک ہیں۔

۲۱ اپریل۔ آج لینن (LENIN) کی ۱۰۸ ویں سالگرہ ہے۔ پانچ بجے شام کریملن پیلس میں بلاوا ہے۔ پونے پانچ بجے کے قریب وہاں سب سفیر مع بیگمات اور دیگر سوویت یونین کے معزز مہمان موجود تھے۔ ٹی۔ وی کے فوٹو گرافر اور اخباری نمائندے بھی کافی تعداد میں تھے۔ سامنے سٹیج پر لینن کی ایک پُر وقار تصویر مزین تھی۔ اور پولٹ بیورو اور ماسکو کی سنٹرل کمیٹی کے تمام ممبران مع جناب برزنیف صاحب کے سُرخ مخملی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں کے سامنے سُرخ، سفید، نیلے، پیلے اور دیگر رنگوں میں تازہ پھولوں کی ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ قومی ترانے کے بعد ماسکو کمیٹی کے چیئرمین نے ایک گھنٹہ تقریر کی جس میں اپنے ملک کے معمار لینن کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مسائل پر بھی تبصرہ کیا۔ غنیمت ہے کہ کرسی کے ساتھ لگے ہوئے آلے سے انگریزی کا ترجمہ ساتھ ساتھ سُنتے رہے۔ تقریر کے بعد انٹرنیشنل سوشلسٹ گیت ان سب نے کھڑے ہو کر گایا۔ اور پس منظر میں بینڈ بجتا رہا۔ اس بسیط ہال میں ہزاروں مہمانوں کی ہم آہنگ آواز ایک عجیب تاثر پیش کرتی رہی۔ غالباً اس گیت کو انقلاب فرانس

کے فوراً بعد ہی تشکیل دیا گیا اور بعد میں شاید رُوسی شاعر نے فرانسیسی الفاظ کو رُوسی زبان میں ڈھال دیا ہو۔ لیکن سُر تال وہی رہی۔ کافی رسیلی ہے۔ ہم تو وقفے کے دوران گھر آگئے ہمارے ساتھ عزیزہ خانم کویت کے سفیر کی بیگم اور فلپائن کے سفیر اور ان کی بیگم (جو کہ ماسکو میں فلپائن کے پہلے سفیر ہیں) بھی آگئے۔ وقفے کے بعد ایک گھنٹہ کنسرٹ (CONCERT) کا پروگرام تھا۔ ریحانہ نے اور میں نے یہ پروگرام ٹی۔ وی پر دیکھا اور سجّاد صاحب سعد میاں کا تاریخ کا جواب مضمون ٹھیک کرتے رہے۔

سعد میاں کو عموماً چھٹیوں کا کام اختتامِ تعطیل کے وقت ہی یاد آتا ہے۔ غالباً یہ سب ہی بچّوں کی محبوب عادت ہے۔ ریحانہ نے گذشتہ ماہ انگریزی اخبار HERALD-TRIBUNE میں TIMES کے ایک اداریے کے خلاف فلسطین کی حمایت میں ایک پرزور خط لکھا تھا۔ اسے یہاں کے عربی حلقوں میں بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ لہٰذا کل بھی سفیر اُردن اور مصری سفارت خانہ کے نائب سفیر جناب فاروق شلبایا (FARCOQ SHELBAYA) بھی اس خیال کی بہت تعریف کرتے رہے۔ اور ریحانہ کو مبارکباد دی۔ یہاں تک کہ سفیرِ اُردن نے کہا کہ اُنھوں نے اس خط کی کئی نقلیں خود کرا کے ماسکو میں عربی سفارت خانوں کو بھجوائیں۔

۱۴ اپریل کو دوشنبہ میں تاجکستان کے قومی شاعر صدرالدین عینیؔ کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب منائی گئی۔ جناب آغا ہاشمی صدر شعبۂ علومِ شرقیہ دوشنبہ تاجکستان نے ہمیں بہت اصرار سے بُلایا تھا۔ بلکہ بقول ان کے وہ ریحانہ خانم کی اپنی بیٹیوں سے مُلاقات کرانا چاہتے تھے اور اس موقع پر اس تقریب میں شرکت کرنے سے ہمیں بھی بہت مسرت ہوتی لیکن حُسنِ اتفاق سے ۱۴ اپریل کو ہی ہلسنکی میں فن لینڈ کے صدر جناب کیکونن (KEKONEN) کی طرف سے سرکاری دعوت تھی جو ہر سال دو دفعہ فن لینڈ کے صدر دیتے ہیں۔ اور اس میں شرکت کے لئے ماسکو سے وہ سفیر جاتے ہیں جن کے دائرۂ عمل میں فن لینڈ بھی شامل ہے۔ سعد میاں نے پہلے فن لینڈ نہیں دیکھا تھا۔ اس بار اسے بھی ساتھ لے گئے۔ ہلسنکی میں سردی ماسکو سے زیادہ تھی۔ ہمارے قیام کے دوران برف باری بھی ہوئی۔ مگر برف و باراں کے باوجود ہوٹل کے دریچوں سے باہر برف کے پس منظر میں

منجمد جھیلیں اور سمندر زیرِ برف آب۔ ٹکڑوں کے جال میں لپٹی ہوئی سُرخ و سبز ریل گاڑیاں، پل پر کھلونے کی طرح گزرتی ہوئی بہت دلکش نظر آتی ہیں۔

---

۱۲ اپریل کو عثمیٰ میاں کی سالگرہ کا کیک ہلسنکی شہر کی مشہور دوکان سٹاک مین سے بنا بنایا لیا۔ جو کافی لذیذ تھا۔ اُسی دکان سے ماسکو کے لئے تازہ پھل بھی خریدے۔

پاکستان سے تاجکی شاعر عینیؔ کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کے لئے جناب حکیم محمد سعیدؔ صاحب اور جناب فیض احمد فیضؔ صاحب تشریف لائے ہیں۔ ۱۴ کی صبح کو ماسکو پہنچتے ہی ان کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ دونوں صاحبان ابھی دوشنبہ میں ہیں اور غالباً وہاں سے سوویت یونین کے وسطِ ایشیا کے دُوسرے شہروں میں بھی جائیں گے۔

آج پیکنگ ہوٹل ریحانہ نے فون کیا تو معلوم ہُوا کہ فیض صاحب تو آج صبح آگئے ہیں۔ اور حکیم سعید کل صبح آئیں گے۔ شاید جناب حکیم صاحب کمال مہربانی سے یہ میرا خط بھی آپ کی خدمت میں لیتے جائیں۔ بھلا ہم جیسے خانہ بدوشوں کو ایسے قاصدِ سعید کب ملتے ہیں؟

۱۹۸۰ء میں ہونے والے اولمپک کھیلوں کی تیّاریاں ماسکو میں گذشتہ سال سے بہت جوش و خروش سے شروع ہیں۔ آج بچّے اولمپک گاؤں کا بنتا ہُوا خاکہ دیکھنے گئے۔ نیا سٹیڈیم بھی بہت عالیشان تیار ہو رہا ہے۔ گویا بقول اقبالؔ یہ آنے والے دَور کی ایک ہلکی سی تصویر ہے۔ اولمپک کے کھلاڑیوں کے لئے شری میتیو (SHERYMATEV) ایئرپورٹ کے ساتھ ہی ایک نیا ائرپورٹ تو ابھی سے تعمیر ہو چکا ہے۔ اور اس سلسلہ میں کئی ہوٹل تب تک مکمل ہو جائیں گے۔ دُنیا کے مختلف ممالک اور ان کے شہریوں کو ایک دُوسرے کے قریب لانے میں کھیل ایک اہم کردار انجام دیتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ سچائی کے اصولوں سے کھیلے جائیں مگر انگریز

قوم سے یہ صفت ان کی EMPIRE کے ساتھ ساتھ خیرباد کہہ چکی ہے۔ لیکن ہمارے نوخیز ملک کے لئے تو صداقت کی کسوٹی ہی اس کی آئندہ کامیابی کی ضامن ہے۔ خصوصاً ہمارے بچّوں کے لئے جنہوں نے ابھی تمام خدا اپنے ملک کو بنانا اور سنوارنا ہے۔

مکتوب ماسکو

۲۳

تاشقند کا بین الاقوامی فلمی میلہ

خونِ رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظؔ ہو کہ بتخانۂ بہزادؔ!
"اقبال"

اس دفعہ تاشقند کا فلمی میلہ مئی کے چوتھے ہفتہ میں منعقد ہوا۔ حسبِ دستور تاشقند کی فضا مختلف ممالک کے جھنڈوں سے رنگا رنگ تھی۔ تاشقند سویت ازبکستان کا دارلخلافہ ہے۔ یہ قدیم روائتی مہمان نوازی کا خطہ ہے اور ایشیا میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس لئے اس بین الاقوامی فلمی میلے کا صحیح معنوں میں مستحق ہے۔ حسب دستور اس دفعہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے فلمی وفود یہاں موجود تھے۔ یہ فلمی میلہ یہاں ہر دوسرے سال منعقد ہوتا ہے۔ اس گہما گہمی میں فلم آرٹسٹ، ڈائریکٹر، پروڈیوسر ٹیکنیشن اخباری نمائندے پروٹوکول کے گائیڈ اور ترجمان اور فلم کے شیدائی تماشائیوں کے گروہ کے گروہ موجود تھے۔ تمام تاشقند کے در و دیوار فیسٹول کے رنگین پوسٹروں سے مزین تھے مگر اصل مرکز ازبکستان ہوٹل تھا۔

شاندار ازبکستان ہوٹل کی ڈیوڑھی کے باہر احاطے میں تمام دن اور رات کے بیشتر حصے تک اسکولوں کے لڑکے لڑکیاں اور یونیورسٹی کے طلباء کی ایک بھیڑ لگی رہتی وہ ہاتھوں میں قلم اور آٹو گراف البم تھامے اپنے اپنے پسندیدہ فلم آرٹسٹوں کا گھیراؤ کرنے

کی کوشش کرتے۔ جیسے ہی آپ شلوار قمیض پہن کر باہر نکلتے اس ہجوم دلبراں میں چاروں طرف سے پاکستانی کا نعرہ بلند ہوتا۔ بجائے انڈین یا بنگلہ دیشی کے اس لباس میں پاکستانی کہلانا موجب عزت ثابت ہوا اور ہم بہت فخر سے سر اُٹھا کر چلتے۔

ازبک باشندے پاکستان سے دل سے محبت کرتے ہیں۔ شلوار قمیض ان کا دیکھا بھالا لباس ہے اکثر خواتین اور اسکول کی لڑکیاں پھولدار قمیض شلوار میں نظر آتی ہیں سچ پوچھیے تو تہذیب و تمدن کی اور دوسری چیزوں کے ساتھ یہ شلوار قمیض کا لباس بھی ہم نے ازبک سے ہی لیا۔ ہماری زبان اردو بھی اسی خزینے کی ایک کڑی ہے۔ شہنشاہ بابر نے فرغانہ سے آکر ہمیں بہت کچھ دیا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تاشقند میں پاکستانیوں کو بہت قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ شمیم آرا یہاں کے عوام کی ایک محبوب شخصیت ہے اس سال تو وہ نہ آسکیں۔ مگر ۱۹۷۶ء کے فلمی میلے میں میں نے دیکھا تھا کہ جہاں بھی وہ ہوٹل سے باہر نکلتیں سینکڑوں کا مجمع پل بھر میں ان کے گرد جمع ہو جاتا۔ اس بار ہمارے فلمی وفد کی خواتین میں مس زرین سلیمان، سنگیتا، کویتا اور ان کی والدہ شامل تھیں۔ مسز زرین سلیمان سنگیتا اور کویتا ایک دم سے یہاں کی منظور نظر بن گئیں۔ ایک دن دانی نے بتایا کہ زرین سلیمان کو ۳۰ لڑکیوں نے بیک وقت اپنے ہالے میں لے کر اپنی البم پر دستخط کروانا چاہا۔ کویتا جب کبھی بھی کھانے کے کمرہ میں کھانا کھا رہی ہوتی تو باہر سے استفسار ہوتا کہ وہ کب باہر نمودار ہوں گی؟ سنگیتا کی بحیثیت ڈائریکٹر ہونے کی بھی قدر ہوئی۔ اسی طرح مسز زرین سلیمان کو جو کہ اپنی فلم "پیار کا وعدہ" کی پروڈیوسر بھی ہیں۔ محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ میلے کی ایک حال کی فلم میں مسز زرین سلیمان کو تاجکی ٹوپی پہنے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ہمارے یہ فلمی نمائندے عموماً شلوار قمیض سادگی اور نفاست سے پہنتے ہیں۔ مجھے سلیمان صاحب کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ کہ بین الاقوامی جلسوں میں ہندوستان بنگلہ دیش، نیپال اور سری لنکا کی خواتین کی موجودگی میں شلوار قمیض ساڑھی کے بجائے یا غرارہ کی مناسب ساکھ ہے اور اسے پہننا

مناسب ہے۔

ازبک زبان یوں تو ترکی ہے۔ لیکن اس میں تاجکی (فارسی) کی بھی آمیزش ہے اس لیے اردو بولنے والوں کے لئے چنداں مشکل نہیں اور آپس میں بات چیت آسانی سے ہو سکتی ہے۔ یہاں کے باشندے خدا کے فضل سے سب مسلمان ہیں۔ قدم قدم پر وہ آپ کو السلام علیکم سے خیر مقدم کہتے ملیں گے۔ اور شکریہ کی جگہ مرحمت یا رحمت زیاد کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو کانوں کو بھلے اور مانوس سے معلوم ہوتے ہیں۔

ہندوستانی فلمیں کئی سالوں سے تاشقند میں بلکہ سویت یونین کے اکثر و بیشتر شہروں میں بکثرت دکھائی جاتی ہیں۔ ان کے فلمی وفد کثیر تعداد میں زائد ممبروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور فلمیں بھی درجنوں لاتے ہیں۔ یقیناً اس کثیر برآمد کا رد عمل انڈیا کے لئے نفع انگیز ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً یہ دیکھئے کہ راج کپور ازبک عوام کے ایک مثالی ہیرو بن چکے ہیں۔ ستم ظریفی کہ یہاں کے اکثر پروٹوکول کے آفیسر بھی اس غلط فہمی سے پاکستانیوں کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کہہ کر مخاطب کرتے نظر آتے ہیں۔ اس دفعہ تو میں نے پروٹوکول کے صاحب کو بتا ہی دیا کہ ہم پاکستانیوں کا طریقہ آداب السلام علیکم ہے جو کہ آپ کے لئے بھی اجنبی نہیں ہے۔

اس بار ریحانہ کے ساتھ تاشقند، بخارا، سمرقند اور فرغانہ دیکھے۔ سبھی جگہ کے لوگوں کو بہت خلیق اور مہمان نواز پایا۔ یہاں تک کہ ازبکستان ہوٹل کے کمرۂ طعام کی خادمائیں بھی بہت ملنسار اور خوش مزاج تھیں، ہوٹل کی نچلی منزل میں میلے میں شامل تمام فلموں کے پوسٹر جا بجا چسپاں تھے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۷۷ء تک سویت فلم کی ترقی کے پوسٹر ترتیب وار دکھائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ایران، مشرقی جرمنی، انڈونیشیا، سری لنکا، پی ایل او انڈیا اور پاکستان نیپال اور لاطینی امریکہ کی فلموں کے پوسٹر بہت خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ انڈیا کے پوسٹر کئی ایک تھے۔ کیونکہ پبلسٹی پیسہ کا کھیل ہے اور بقول سعید احمد صاحب کے ایک پوسٹر کو لگانے کی قیمت فقط دو صد ڈالر تھی۔ عام طور پر پاکستان کے اخباروں میں بیرونی

ممالک کے پاکستانی اداروں کی شکایت تو عام سنی جاتی ہے لیکن اس بات کو ہمارے مہربان نظرانداز کر جاتے ہیں۔ کہ جتنا گڑ ڈالیئے اتنی ہی مٹھاس بڑھتی ہے۔ اب سوویت یونین جیسے عظیم ملک میں ماسکو میں پاکستان کے سفارتخانہ کو ہی دیکھئے۔ سفارتخانہ کا دفتر بالکل اصطبل معلوم ہوتا ہے۔ یہ مختصر سی عمارت دو عدد گیراج کے اوپر تعمیر شدہ ہے جو ایک معقول دفتر کے لئے بالکل نامناسب ہے۔ یہی یہاں کے دفتر کے اسٹاف کا حال ہے۔ جو گنتی میں امریکہ میں ہمارے سفارتخانہ کے اسٹاف کا دسواں حصہ بھی نہیں ہوں گے یہ بات کون نہیں جانتا کہ روس اور امریکہ دونوں ہی بڑے اور ذی اثر ملک ہیں کام کا حجم بھی اسی اعتبار سے ناپا جا سکتا ہے۔

اس شب کو ازبکستان ہوٹل کے نچلے ہال میں ہر وقت ایک قسم کا مینا بازار سا نظر آتا۔ مختلف اقوام کے لوگ قسم قسم کے ملبوسات میں مختلف زبانوں میں مصروف گفتگو نظر آتے اسس ہوٹل کے وسیع اور خوب صورت ہال میں ہر ملک کے مندوبین کیلئے علیحدہ علیحدہ میزیں ناشتہ اور کھانے کی مخصوص تھیں۔ جن پر ان ملکوں کے جھنڈے درمیان میں پھولوں کے ہمراہ سجے نظر آتے۔ ترکی، روسی، فارسی، عربی، ہندی فرانسیسی اُردو، بنگالی سبھی بولیاں ان میزوں پر سنائی دیتیں۔ یہاں کی خادماؤں کا لباس ازبک کی مخصوص اطلس ہے۔ یہی قیمتی اطلس پرانے زمانے میں ہندوستان لاکر فروخت کی جاتی تھی۔ مجھے اپنی والدہ کے اطلس اور گلبدن کے چند لباس یاد ہیں کھانے کے اس ہال میں خادمائیں اپنی سرخ اور زرد اطلس کی یونیفارم میں بہت شگفتہ نظر آتی تھیں۔ پانچویں منزل پر ہمارے کمرہ کے باہر جو ٹیلیفون آپریٹر تھیں۔ اس کی یونیفارم سنہرے اور سفید اطلس کی تھی۔ ۲۶ مئی کو ہماری فلم امبر آرٹ پیلیس سینما میں دکھائی گئی یہاں جو فلمیں مقابلہ میں شامل کی جاتی ہیں۔ وہ اس شاندار سینما میں پیش کی جاتی ہیں۔

نمائش کی دیگر پاکستانی فلمیں شہر کے دوسرے سینماؤں میں دکھائی جاتی ہیں "امبر" فلم میں ندیم، ممتاز، محمد علی، دیبا، نے کام کیا ہے فلم شروع ہونے سے پہلے ہی ہال

تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ پردہ سیمیں اُٹھنے سے پہلے ہمارا فلمی وفد بہت شان سے اسٹیج پر آیا۔ بہت بانکپن سے فرداً فرداً ایک ازبک نازنین نے ان کا حاضرین سے تعارف کرایا۔ حاضرین نے بے پناہ تالیوں سے ان کا استقبال کیا جب تک وہ سب اسٹیج پر سے اتر کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ نہ گئے تالیاں گونجتی رہیں یہ فلم کافی دلچسپ ثابت ہوئی کہانی کے ہر مذاق پر لوگ قہقہے لگاتے رہے۔ فلم کے مناظر میں ایک جگہ رد پہلی سے درختوں کے جھرمٹ دکھائے گئے ہیں موسیقی کے زیر وبم میں یہ منظر واقعی بہت دلچسپ تھا۔ اس مخصوص سیٹ کے بنانے والے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ چند غیر ضروری مکالموں، اور گانوں کے باوجود یہ فلم اچھی رہی اور بہت پسند کی گئی۔

۳۰ تاریخ کو شہر کے دوسرے سینما ہال میں "مجھے گلے لگا لو" دکھائی گئی اس کی ڈائریکٹر سنگیتا ہیں وہ اس میں کام بھی کرتی ہیں۔ میں خاص طور پر اسے دیکھنے گئی۔ میرے خیال میں یہ بھی کامیاب کوشش ہے حاضرین نے اسے پسند کیا۔ خصوصاً کونیا کے کام کو جو اس میں نادان لڑکی کا کام کرتی ہے۔ مسز سلیمان کی فلم "پیار کا وعدہ" ہم نہ دیکھ سکے مسٹر اور مسز سلیمان کے مذاق سلیم سے مجھے کامل اُمید ہے کہ یہ فلم یقیناً اچھی ہو گی۔

عزیزہ ریحانہ نے ایک شامی فلم دیکھی جس میں عربوں کے روائتی مخصوص مناظر دکھائے گئے تھے۔ ترکی کی ایک فلم جس کو انعام بھی ملا بہت موثر تھی۔ اس میں استنبول کے مناظر اور گولڈن ہارن میں غروب آفتاب کے منظر بہت خوبصورتی سے دکھلائے گئے تھے اس میں ملیحانے کام کیا ہے۔

۲۹ مئی کو ازبک موسیقی کا ایک کنسرٹ تھا۔ موسیقی اور یہاں کے رقص بالکل ہماری موسیقی اور رقص سے ملتے جلتے ہیں۔ میرے خیال میں تو ہمارے لوک رقص "جھومر" اور "لڈی" ہمارے ملک میں ازبکستان سے لئے گئے ہیں۔ بقول غالب ؎

وہی نقشہ ہے جلوہ گری ویسی ہی ہے
(غالب)

چند گیت فارسی تھے رقاصاؤں نے سنہری اطلس کے پشواز، کمخواب کی بنر صدریاں

سنہری کارچوبی ٹوپیاں اور باریک ریشمی سُرخ اوڑھنیاں پہن رکھی تھیں۔ ایسی باریک جیسے آبِ رواں ہوں۔

۳۰ تاریخ کو ازبکستان حکومت کی طرف سے ایک دعوت تھی جس میں سبز، سرخ اودے، پیلے ملبوسات کا ایک ہجوم انار اور نارنگیوں کی کلیوں کی طرح نظر آ رہا تھا۔ پل پل میں فلش بلب چمکتے اور فوٹو گرافر تصویریں اتارتے تھے۔ ایک طرف ایک ازبک مغنیہ ساز سنبھالے ہوئے تھی۔

اس میلے کا اختتام محترمہ میڈم عبداللہ نے آرٹ پیلس میں کیا۔ انہوں نے اپنی الوداعی تقریر میں کہا کہ معاشی الجھنوں کو اور مردوں اور بچوں کی نفسیات کو سمجھنے میں فلمیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس طرح ہم مل جل کر آسانی سے ان مشکلات کا حل امن اور دوستی میں تلاش کر سکتے ہیں۔ فلمی میلہ کے جھنڈے کے اتارنے کی رسم قومی ترانے کے بعد ادا کی گئی۔

ہمارے وفد کے قائد نے بتایا کہ ہماری فلم "راہبر" کو اس انعامی مقابلہ میں ایک امتیازی سرٹیفکیٹ اور ایک بلوری خوبصورت پھولدان ملا ہے۔ مبارک باشد۔

اس طرح ۱۹۷۸ء کا فلمی میلہ خوش اسلوبی سے اختتام کو پہنچا۔ سجاد صاحب، ربانہ اور میں اس خوشگوار تاثر کو لے کر ماسکو آئے کہ ازبکستان کے لوگ ہمارے قریب ترین ہمسائے تو ہیں ہی ان کے دل بھی ہم سے قریب ترین ہیں۔ انہوں نے ہمارے فلمی ستاروں کی بہت چاؤ سے آؤ بھگت کی اور انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔

ہمارے ملک کے لئے اہلِ ازبکستان کا دوستانہ بلکہ برادرانہ برتاؤ باعثِ صد ناز ہے مگر کچھ یہ انداز نیا نہیں ان کا یہ جذبہ خیر سگالی قدیم شاہراہ ملک کی خوشگوار یادوں کو تازہ کرتا ہے۔ جیسا کہ یکم جون کو سجاد صاحب نے ازبک کے مشہور و معروف شہر فرغانہ کے رئیس کو مخاطب کرتے ہوئے فارسی میں کہا کہ اس وادیٔ جیحون و سیحون کا ہم سے ناطہ صدیوں پرانا ہے شہنشاہ بابر نے اسی سرزمین سے چل کر ہمارے ہاں ایک عظیم سلطنت اور ایک درخشاں تمدن کی بنا ڈالی۔ ہم آج اس مقدس سرزمین کو خراج عقیدت پیش کرنے آئے ہیں اور ان

کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

"تشکر و مرحمت زیادہ" لیوں زبان کا کیا تکلف خلوص بڑی چیز ہے کہ ؎

ترکی بھی شیریں تازی بھی شیریں
حرفِ محبّت ترکی نہ تازی!!
(اقبالؒ)

○

مکتوب ماسکو
۲۴

لینن کا گاؤں

ع
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

اب نا معلوم لینن کے گاؤں (ولاڈیمیر ایلیچ لینن) کے باد صبا سے کیا عہد و پیمان ہوئے کہ ان کی ۱۰۸ ویں سالگرہ پر آج رنگ چمن اسقدر پُر بہار ہے!! ۲۲ اپریل کو ہم سب کو "اولمپک گاؤں" دکھانے گئے، ہفتہ کا روز تھا یعنی چھٹی کا دن، اس کے باوجود شہر میں اور شہر سے باہر بن میں جدھر دیکھو۔ مرد و زن، لڑکے لڑکیاں ذوق و شوق سے کچھ نہ کچھ ہاتھ سے کام کرتے نظر آرہے تھے۔ شہر میں تو دیکھا کہ جا بجا ماسکو والے اپنے اپنے گلی کوچے اور گھر کے سامنے کے پارک میں کتر بیونت میں مصروف تھے۔ ہاتھوں میں بیلچے، کدال اور گھاس صاف کرنے کے لئے جھاڑو تھے اور شہر سے باہر بنوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی گھاٹیوں کی گرد ایسی دیدہ ریزی سے اتاری جاتی ہے۔ جیسے ہمارے ہاں شادیوں سے پہلے نائی آستین چڑھا کر متنجن اور بریانی کے لئے باسمتی چاولوں کی دھلائی کرتے ہیں۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر ڈرائیور روالکوف سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ ہر سال سویت یونین میں ہفتہ کے ایک روز ہر شہری صبح کے چند گھنٹے

اپنی رضا و رغبت سے سماجی کام کرتا ہے۔ چاہے وہ کوئی نیا پودا لگائے یا لگائے پودوں کی آبیاری کرے۔ کیاریاں سینچے، شہر کی صفائی میں حصہ لے یا شہریوں کے آرام کے لئے کوئی کام کرے۔ مثلاً کسی بچوں کی نرسری میں کچھ دیر جا کے بچوں کی نگرانی میں دلچسپی لے۔ انہیں کوئی کھیل کھلائے کوئی گیت سکھائے یا شہر کو خوبصورت بنانے میں باقاعدہ حصہ لے۔ رانی کی روسی زبان کی استانی نے کل ہی بتایا تھا کہ وہ آج صبح مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے آئے گی۔ کیونکہ دس بجے سے پہلے اسے سبوتنک پر جانا ہے یہ لفظ سبوتنک سابتیھ SABATH سے نکلا ہے۔ سیبط، عبرانی زبان میں ہفتہ کو کہتے ہیں۔ جسے عربی میں "سبت" کہتے ہیں۔ اور اسی ہفتہ کے روز کام کرنے کو یہاں سبوتنک SABBOTANIK کہا جاتا ہے۔

اس سال حسن اتفاق سے سبوتنک کا تہوار لینن کی سالگرہ کے ساتھ ساتھ آیا۔ لینن کی ۱۰۸ ویں سالگرہ کی تقریبات کا ذکر تو میں نے اپنے گذشتہ خط میں تفصیل سے کیا ہے۔ آج میں خاص طور پر لینن کا گاؤں کا جسے لینن سگایا گورکی کہتے ہیں LENINSKAYA GORKI "مختصر سا خاکہ کھینچوں گی یاران نکتہ داں کے لئے"۔

یہ چھوٹا سا گاؤں ماسکو شہر سے موٹر میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ہے دو سال سے وہاں جانے کا پروگرام بناتے رہے۔ مگر کچھ نہ کچھ مصروفیات مانع رہیں۔ آج پیر کو یوم فتح کی تعطیل ہے۔ (یعنی جرمنی پر فتح کی خوشی میں) سوچا کیوں نہ اس گاؤں کا چکر لگائیں۔ سجاد صاحب حسب عادت چھٹی کے دن بھی دفتر کام کرتے ہیں۔ انہیں بمشکل آمادہ کیا۔ گھر سے چلے۔ منیرا ختر نے ہلکا سا ناشتہ توشہ دان میں رکھا غلام حیدر نے کشمیری چائے تھرماس میں ڈالی۔ بارہ بجے روانہ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب لینن سگایا (LANINIS KAYE) پہنچے ایک خوبصورت سرسبز وادی میں یہ چھوٹا سا گاؤں واقع ہے۔ ایک بل کھاتی ہوئی ندی کو پار کر کے گاڑی لینن کے گھر کے احاطے میں داخل ہوئی اور اس

احاطے کے اندر کی سڑک پر کافی دور تک دوڑتی رہی۔ دائیں بائیں درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ اور بیچ بیچ میں کھیت ولیسا ہی منظر پیش کرتے رہیں جیسا کر ایبٹ آباد کے راستہ میں ہری پور جاتے ہوئے۔

یہ تاریخی مکان ایک بہت بڑے باغ میں گھرا ہوا ہے۔ اس باغ کی چار دیواری کے سیب کے درختوں کے چمن زار بالکل المانیہ کے چھوٹے سے قصبہ گونگز ونٹر کے آلوچہ، ناشپاتی اور چیری کے مرغزاروں کی طرح ہیں جہاں ہم نے تین سال گزارے تھے۔ وہاں گھر سے دفتر جاتے ہوئے دریائے رائین RAINE کو خیری سے پار کرنا پڑتا ہے۔ اور اس سے پہلے سڑک کے دونوں طرف کھیت اور پھلوں کے ہرے بھرے باغ آنکھوں کو حرارت بخشتے ہیں خصوصاً شگوفوں کے موسم میں، بقول غالب جنت نگاہ بن جاتے ہیں۔

ماسکو میں بہار دیر سے آتی ہے۔ مگر آتی تو ہے۔ وہ جو ایک بھلے سے انگریزی زبان کے شاعر نے کہا ہے ؎

اگر سرما آتا ہے تو بہار کیوں کر پیچھے رہ سکتی ہے۔

ایک پرانے مخزن رسالہ میں نظم شائع ہوئی تھی۔ جو میری والدہ کو بہت پسند تھی۔ جس میں ایک بچہ اپنے باپ سے پوچھتا ہے ؎

سچ بتا بابا کب آئے گی بہار

ماسکو میں موسم سرما کی صعوبت دیرپا ضرور ہے۔ لیکن جب بہار آتی ہے۔ تو ٹوٹ کر آتی ہے اور پلک جھپکتے ہی حضرت امیر خسرو کی زبان میں "پھول رہی سرسوں سکھی ری پھول رہی سرسوں" کا منظر سامنے ہوتا ہے۔

بڑے دروازے میں داخل ہوتے ہی شروع میں دائیں جانب ایک دفتر کی عمارت ہے جہاں آپ کو سب معلومات اس تاریخی مکان کے متعلق مل سکتی ہیں، ساتھ ہی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ آپ یہاں سے یادگار تصویروں کے پوسٹ کارڈ خرید سکتے ہیں۔ اس دفتر کے اندر کے ہال میں یہاں کی سیکرٹری مادام الکزینڈرا

ہماری منتظر تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ اندر کے ایک بڑے آڈیٹوریم میں ہر ایک گھنٹہ بعد لینن کی زندگی پر مبنی ایک فلم دکھائی جاتی ہے۔ چونکہ آپ دیر سے پہنچے ہیں۔ وہ فلم اب شروع ہو چکی ہے۔ اس عرصہ میں آپ ان کا گھر دیکھ آیئے۔ پھر وہ میزبان خاتون ہمیں خود باغ میں راستہ دکھانے لے گیئں لینن کے گھر کو جو راستہ جاتا ہے۔ اس کے ارد گرد گھنے چیڑ کے درخت ہیں۔ جنہیں دیکھ کر غلام حیدر کا دھیان فوراً آزاد کشمیر میں اپنے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ بائیں طرف سڑک کے نیچے ایک صاف شفاف پارہ کی طرح چمکتی ہوئی جھیل نظر آ رہی تھی۔ گویا بقول اقبالؒ "ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو" اور دُور دُور سبزہ زار حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ لینن نے زندگی کا آخری حصہ جب کہ ان کی صحت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اس پر سکون وادی میں آرام سے گذارا۔ اس خاموش پر فضا جگہ کو دیکھ کر بانگِ درا کی مشہور نظم "ایک آرزو" کے اشعار کانوں میں گونجتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلہ کو میری صدا درا ہو

یہاں آنے سے پہلے لینن کریملن کے اندر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ یہاں کبھی کبھی ہفتہ یا اتوار کو آرام کے لئے آ جاتے تو بھی شب و روز دفتر کا کام بدستور کرتے رہتے۔ ویسے زندگی کے آخری دور میں بھی جو اس سادہ حسین فضا میں گذرا یہاں اپنی سنٹرل کمیٹی کے ممبرز کو بلا کر حکومت کے کام برابر کرتے رہتے۔ کبھی کبھار اپنی اہلیہ مادام کیرپسکایا KRUPSKAYA کے ساتھ اپنے کسی پسندیدہ تھیٹر میں چلے جاتے تھے جیسے ٹالسٹائی کی وار اینڈ پیس لینن کہتے کہ یہ کتاب انقلاب کی آئینہ دار ہے۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ہم اس تاریخی مکان کی اصلی ڈیوڑھی تک جا پہنچے۔ یہاں ایک وسیع احاطے میں ہلکے زرد رنگ کی تین عمارتیں ہیں۔ یعنی درمیان میں ایک بڑا مکان ہے۔ دائیں ہاتھ پہ مہمان خانہ بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا بنگلہ۔ سامنے چمن ہے۔ چھوٹے بنگلے کے سامنے کی روش پہ دائیں جانب ایک لوہے کا سفید رنگ کا بینچ پڑا ہے۔ جس سے نیچے کی سرسبز عمیق گھائی میں وہی پہاڑی نالہ ایک الھڑ چال سے بہتا نظر آتا ہے۔ گائیڈ نے رانی کو بتایا کہ لینن اکثر اپنے کتے کو لئے اس بینچ پر بیٹھ کر سستایا کرتے تھے۔ گائیڈ اور ہمارے درمیان رانی ترجمانی کا کام بخوبی انجام دیتی رہی۔ چلو تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ روسی زبان کا کچھ مہاورہ تو ہوا۔ میں نے رانی سے کہا۔

اور آپ کی ترجمانی کی فیس بھی بچ گئی ساتھ ساتھ آپ کو بھی آرام رہا" رانی بیگم بولیں۔

پہلے ہم اس چھوٹے سے گھر میں گئے جہاں نچلی منزل میں چھوٹی سی ڈیوڑھی سے گذر کر ایک طرف لینن کا دفتر اور دوسری طرف ملاقات کا کمرہ ہے۔ زینہ سے اوپر چڑھتے تو خواب گاہ، چھوٹا سا کھانے کا کمرہ اور باورچی خانہ وغیرہ ہے۔ گھر کا تمام فرنیچر سادہ لیکن ہر چیز بالکل صاف شفاف، کمروں کا لکڑی کا فرش پالش زدہ ہے لینن کے دفتر میں چمن کی طرف کھلتے ہوئے دریچے کے سامنے لکھنے کی میز اور کرسی میز پہ سب ان کے ہاتھ کے لکھے ہوتے۔ سرکاری کاغذ اور خط پہ زتے تک فریم کئے ہوئے۔ دیواروں پر لینن کی تصویریں ہاتھ سے کام کرتے ہوئے۔ لکھتے ہوئے۔ تقریر کرتے ہوئے۔ کارخانوں میں مزدوروں کے ساتھ کھیتوں میں کاشتکاروں کے ساتھ۔ مدرسوں میں طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے اور کریملن میں اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اور لال چوک میں عوام کے دوش بدوش آویزاں ہیں۔ مطالعہ کی میز پر ان کے اس وقت کے استعمال کے معمولی سا قلم دوات اور سادہ کاغذ یہاں تک کہ اس روز کے کیلنڈر تک کا صفحہ اسی طرح کھلا ہوا ایک دنیا نوسی قسم کا ٹیلی فون

دیوار پر جو اس زمانہ میں بقول ہمارے گائیڈ کے کم ہی کام کرتا تھا۔ جس سے ماسکو اور چند قریب کے شہروں تک ہی بات ہوسکتی تھی۔

انگیٹھی پر رکھی ہوئی کلاک بلکہ گھر کی تمام گھڑیاں اسی گھنٹہ پر بند ہیں۔ ویسے یہاں چہل پہل کی کمی نہیں آج بھی کئی سو روسی باشندے، بچے بڑے جوق در جوق موجود تھے۔ اور قطار میں اپنی باری سے اندر جاکر اپنے ملک کے معمار کی گھریلو زندگی کا ایک رُخ اتنے قریب سے بہت شوق و مسرت اور افتخار کے ملے جلے جذبات میں دیکھتے چلے جاتے تھے۔ یوں سیاحوں کی بھی فوج کی فوج تھی ماشاللہ۔

زندہ قوموں کی روایات کچھ یوں ہی تو نہیں بن جایا کرتیں۔ صدیوں بعد کسی قوم میں دیدہ ور پیدا ہوتے ہیں اور شب و روز کی محنت سے اپنے ملک کی خوشحالی کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ پھر صدیوں بعد یہ پودا بارآور ہوتا ہے بقول ہمارے رہبر اعظم کے ؎

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

اور

قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

چلئے اب ذرا زینے سے اوپر جاکر دیکھئے۔ یہاں ایک تنگ سی غلام گردش سے گذر کر لینن کا کمرۂ خواب ہے۔ سادہ سا پلنگ جس پر ہاتھ سے کڑھا ہوا سفید ہی پلنگ پوش جو ان کی والدہ محترمہ نے وقتِ رُخصت دیا تھا۔ پلنگ کے قریب لکھنے کی میز کرسی، میز پر ایک سبز گلوب لگا لیمپ کاغذ، کئی قلمیں، دوات اور بے شمار ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کاغذات اور ذاتی خطوط میز پر موم بتیوں کا ایک پیکٹ اور ایک شمعدان بھی۔ بجلی اس زمانہ میں عام رائج نہ ہوئی تھی۔ اور اگر تھی بھی تو اکثر لینن کو لیمپ اور موم بتی کی روشنی میں کام کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ تمام ملک کو بجلی سے روشناس

کرنے کی اسکیم بھی لینن نے اس گھر میں ہی تیار کی۔ نچلے دفتر میں لینن ایک تصویر میں اپنی اس اسکیم کا جائزہ دکھا رہے ہیں اور اب دیکھئے اس وسیع ملک کا گاؤں گاؤں، گوشہ گوشہ روشنی سے منوّر ہے۔ قریب ہی ایک تپائی پر پانی پینے کی صراحی اور گلاس سونے چاندی کے نہیں بلکہ معمولی کانچ کے۔

الماری میں ان کی پسندیدہ بہت سی کتابیں قطار اندر قطار، لینن کی کریملن کی مطالعہ کے کمرہ میں ان کی ذاتی کتابیں ہر علم پر یعنی کئی ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ لینن روسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ہسپانوی، اطالوی زبانوں کے علاوہ مختلف سلاو زبانیں بھی جانتے تھے۔ باغ کی طرف کھلتے دریچے پر پھولدار سوتی پردے ہوا سے اڑ رہے تھے۔ اور باہر چمن میں ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔

ان کی اہلیہ نداژدا کرپسکایا کا چھوٹا سا کمرہ بھی ایسے ہی سادہ سامان سے مزیّن تھا۔ مطالعہ کی میز پہ ایک سفید گلوب لگا لیمپ، دو چار تصویریں، کتابوں کی الماری اور برف کی طرح سفید پلنگ پوش اور تکیے۔ نداژدہ لفظ کے معنی روسی میں اُمید کے ہیں۔ (بغداد اور قاہرہ میں کئی لڑکیوں کے نام (امل، سنے، امل، عربی میں اُمید کو کہتے ہیں۔) مادام نداژدہ بچوں کی ڈاکٹر تھیں اور اس کے علاوہ اپنی پارٹی کے کام میں بہت حصّہ لیتی تھیں۔ یہ بہت پڑھی لکھی قابل خاتون تھیں۔

لینن کی دونوں بہنیں (ماریا، اور ایا نوا کٹوزیہ، بڑے بھائی کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ ان کے کمرے بھی سادگی مگر نفاست سے آراستہ تھے۔ غیر ضروری تکلّف اور آرائش کا سامان تمام گھر میں نظر نہ آیا۔ یہ دونوں بہنیں بہت پرجوش اور مخلص سماجی کارکن تھیں۔ ایک بہن یہاں کے مشہور اخبار "پراودا" میں لکھتی تھیں۔ اور دوسری بہن یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔ نیچے کے کمرہ ملاقات کی ایک تصویر میں ایک فیملی گروپ میں لینن کے ساتھ سب بھائی بہن اور مادام نداژدہ اکٹھے ہیں۔ لینن کے ساتھ ایک چھوٹا سا لڑکا کھڑا ہے جو ان کا بھتیجا ہے۔ اور ان کو بہت عزیز تھا۔ اس مکان کے باہر

ملحقہ اصطبل ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہاں گھوڑے رکھے جاتے تھے۔ اب وہاں لینن کی گاڑی کھڑی ہے اس گاڑی کی عجیب و غریب چیز اس کے پہیے ہیں۔ جو برف پر چلنے کے لئے SLEDGE نما بنے تھے۔ موٹر گاڑی کے علاوہ یہاں پر چلنے والی ایک گاڑی ہے جسے آپ رتھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس پر دو گھوڑے جوتے جاتے ہیں، ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ اسے شدید برف باری کے موسم میں لینن آس پاس کے گاؤں میں جانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اس گھر میں غالباً لینن ۱۹۲۳ء تک رہے۔ بعد میں ۱۹۴۰ء میں اس گھر کی ایک ایک چیز سینت کر لسے ایک یادگار تاریخی عجائب گھر بنا دیا گیا جو اب مرجع خاص و عام ہے۔

اس تاریخی عمارت اور باغ کو دیکھ کر واشنگٹن کے قریب ماؤنٹ ورنن (MT. VERNON) کی عمارت اور باغ کا خیال آیا۔ امریکہ میں بھی اپنے ہر دل عزیز صدر کے گھر کے ذاتی سامان کی ہر چیز فرنیچر، کتب خانہ یہاں تک کہ باورچی خانہ کے ظروف اور اصطبل میں گھوڑوں کی زین و لگام تک کو بہت سلیقہ سے آنے والی نسلوں کے دیکھنے کے لئے محفوظ کر لیا گیا ہے کہ زندہ قوموں اور افق پر ابھرنے والے ملکوں کے یہی طور ہوتے ہیں۔ یہ آزاد اور باہمت انسان اپنے اپنے قائد کے نقشِ قدم پر چل کر اب ستاروں کو بھی گردِ راہ بنا رہے ہیں اور ہم ..... ابھی زندگی کی شبِ تاریک کو سحر بھی نہیں کر سکے۔

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

(اقبال)

مکتوب ماسکو

۲۵

ماسکو کے قدیم بازار عربات

مرکزی شہر ماسکو میں دو بازار عربات جدید اور عربات قدیم نام کے ہیں۔ ماسکو شہر سادووا کالٹسو حلقے میں ہے۔ سادووا کا مطلب ہے۔ باغ اور کالٹسو کے معنی ہیں حلقہ یا انگوٹھی اسے روڈ بھی کہتے ہیں۔ ماسکو رنگ روڈ کی نمایاں بات یہ ہے کہ اس سڑک کے دونوں طرف سرسبز درخت ہیں۔ اسی لیے اس کو گارڈن رنگ بھی کہا جاتا ہے۔ اس بڑے حلقے کے درمیان بیچ در بیچ سڑکوں کو لیے ہوئے ایک اور حلقہ ہے۔ ان کے درمیان باغات کا سلسلہ چلا آتا ہے ان باغات والی سڑک کے ساتھ ساتھ ایک نہر بہتی ہے۔ اس سڑک کو ساڈووا بلے وارڈ کہتے ہیں۔ بر سبیلِ تذکرہ پاکستانی سفارتخانہ بھی اسی سڑک کے ایک حلقے سادووا کدرن سکایا پر واقع ہے۔ اور غریب خانے کا نمبر ۱۷ ہے۔ آپ اگر تشریف لائیں تو چشم ما روشن دل ماشاد۔

عربات کا نام عربی سے لیا گیا ہے۔ غالباً قدیم زمانے میں اس سڑک کے آس پاس عرب تاجر رہا کرتے تھے۔ شاید اسی لئے اس بازار کو عربات کہنے لگے ہیں۔ اب اسے حسنِ اتفاق کہیئے کہ موجودہ زمانے میں سوویت یونین کے دور دراز شہروں میں کسی نہ کسی محلے کو عربات کا نام دیا جاتا ہے مثال کے طور پر سائبیریا میں اس نام کا ایک محلہ ہے۔ میں اور ریحانہ گذشتہ ستمبر میں سوویت یونین کے وزارت خارجہ کے وفد کے ساتھ سائبیریا گئے تھے۔ وہ ایک دلچسپ جگہ ہے (گھنے گھنے جنگلات اور



تاشقند میں ایک نو بیاہتا جوڑا تحائف وصول کر رہا ہے۔



بائیکل جھیل کو دامن میں سمیٹے ہوئے سائبیریا آج سیاحوں کی دلفریب جنت ہے)
غالباً یہ نام ماسکو کے شہریوں نے سوویت یونین کے دور افتادہ شہروں کی یاد
میں رکھا ہوگا۔ کہ وطن سے دور وطن کی گلیاں بھی بہت پیاری معلوم ہوتی ہیں۔
حضرت ذوق نے شاید اسی جذبہ بے اختیار کے زیر اثر لکھا ہوگا۔

ع۔ کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر۔

خاکسار کو بھی حضرت ذوق سے پورا پورا اتفاق ہے۔ آپ نے غالباً ایک
زمانہ ہوا ماہِ نو میں جناب عادی حسن صاحب کے قیام بنکاک کے زمانہ میں ان کی
نظم کا یہ شعر پڑھا ہوگا۔

ع۔ اے کراچی کے ریت کے ذروں میری آنکھوں میں بار بار رہو

سجاد صاحب کے دوست (یہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر غالباً بلیشیا یا
سنگاپور کا ذکر ہے) ٹھیٹھ جالندھری پنجابی میں کہا کرتے تھے کہ یہاں کی سرسبز
فضا سے جالندھر کی دھول مجھے عزیز تر ہے۔ یہ عزیز دوست جرنیل ہو گئے تھے
نہ معلوم آج کل کہاں ہیں۔

فن تعمیر کے لحاظ سے عربات بازار میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ایک عام
صاف ستھری سی چوڑی سڑک ہے ویسے ماسکو میں اس سے بھی فراخ سڑکیں ہیں۔
اس سڑک پر پرانی طرز کے ایک منزلہ مکان تعمیر ہیں۔ جو نئی بنی ہوئی اونچی اونچی
عمارتوں کے ساتھ گڑیا گھر معلوم ہوتے ہیں۔ غالباً اس بازار کی یہی چیز دلچسپی کا
باعث ہے۔ یہاں پرانے وقتوں کے گھر چوبی ہوا کرتے تھے۔ جن میں سے بیشتر نپولین
کے مختصر قیام ماسکو کے دوران نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ ان میں سے چند ایک لکڑی
کے گھروں کو دوبارہ اسی قدیم طرز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ لکڑی پر پلاسٹر لگا کر مختلف
رنگوں سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اِن چھوٹے چھوٹے گھروندوں کے آگے
لکڑی کی شاہ نشین (بالکونی) اور لکڑی کے ستون قوس و قزح کے رنگوں میں خوشنما

نظر آتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں عربات کے ان مخصوص مکانات کی طرز تعمیر کو تفریحاً ماسکو ایمپائر سٹائل کہتے ہیں۔ سیاح شام کو دور دور سے اسے دیکھنے آتے ہیں۔

عربات کے عقبی محلہ میں لیو ٹالسٹائی کا مکان جو آج ایک خوبصورت عجائب گھر ہے۔ ٹالسٹائی کی مشہور کتابیں اور ان پر مبنی فلمیں مثلاً اینا کرینا وار اینڈ پیس وغیرہ۔ بین الاقوامی فلمی نمائشوں میں بار بار انعام حاصل کر چکی ہیں۔ اینا کرینا کی فلم میں نے اوّل مرتبہ حمید بھائی کے ساتھ مل کر دیکھی تھی۔ حمید بھائی کلکتہ سے چھٹی پر لاہور آئے تھے۔ وہ زبیدہ اور میری فرمائش پر یہ فلم ریگل۔ سینما میں دکھانے لے گئے تھے۔ ہم دونوں اس وقت لاہور کالج فار ویمن میں ایف اے کی طالبات تھیں۔ اس وقت لاہور کالج ہی ایک منتخب عمدہ علمی ادارہ تھا۔ رول پر صرف ۱۲۵ لڑکیاں تھیں۔ مس گیری ہماری پرنسپل منتظم کی بہت پابند تھیں۔ ریگل سینما کی بھی بات کیا تھی۔ نرم نرم سرخ مخمل کی نشستیں اور غلام گردش کے زینہ تک قدموں تلے سرخ قالین۔ گویا اصلی معنوں میں سرخ قالین سے ... خیر مقدم کیا جاتا ہے پورا سینما ہال پان کی پیکوں سے آزاد اور صاف و شفاف تھا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ انگریز سے آزادی حاصل کر کے ہم اسلام کے عام اصولوں سے بھی بے نیاز ہو چکے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے مذہب میں پاکیزگی کو ایمان کے بعد دوسرا اہم مقام حاصل ہے۔

خیر جانے دیں بات تو میں کر رہی تھی۔ ٹالسٹائی کی فلم کی اس فلم میں اداکارہ گریٹا گاربو نے کام کیا تھا۔ اب ماسکو آ کر گذشتہ سال دفتر امورِ خارجہ کی طرف سے ایک ڈپلومیٹک دعوت میں اینا کرینا کا بیلے دکھایا گیا۔ رانی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ یہ رقص ڈراما واقعی قابلِ دید ہے کہ بقول اقبال ؎

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

سعد چھٹیوں میں آیا تو اسے بھی یہ کھیل بالشوئی تھیٹر میں دکھایا۔ کھیل کے آخری منظر میں برف پر سے گذرتی ہوئی ریل گاڑی کی آواز اور برف سی فضا میں انجن کی

دہکتی ہوئی سُرخ روشنی ایک ناقابلِ بیان تاثر پیش کرتی ہے۔

وار اینڈ پیس (جنگ و صلح) کی فلم انگریزی میں پہلے دیکھ چکی تھی اور قیام دہلی میں وہاں جناب روسی سفیر (جو کہ بہت شستہ فارسی بولتے تھے۔) کی اپنی خاص دعوت پر اس کا پہلا حصہ روسی زبان میں دکھایا گیا تھا جو کہ انگریزی فلم سے کہیں زیادہ ممتاز ثابت ہوا۔ باقی کے دو حصّے ابھی تک نہیں دیکھ پائی۔ ایک بار ہمارے گھر کے قریب سینما میں یہ فلم آئی تو مگر ڈرائیور نکولائی وقت پر ٹکٹ نہ لا سکے۔ بہر حال دنیا با اُمید قائم! البتہ یہاں یونانی سفارت خانہ کی ایک دعوت میں یونانی سفیر نے بتایا کہ اس فلم کے ایک رقص کا منظر اس کے سفارت خانہ کے بڑے ہال میں فلمایا گیا ہے۔

بختنگف ایک باکمال ایکٹر تھا۔ اس کا بنایا ہوا بختنگف تھیٹر آج بھی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس فنکار کا سٹوڈیو بھی عربات میں ہے جنیس نامی دو بہنوں نے اسی سڑک پر موسیقی کا اسکول شروع کیا تھا۔ جو کہ آج بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ اور کونسرٹ ہال ہے ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد یہاں مشہور موسیقار الیکزانڈر کے گھر کو ایک قومی عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح روسی زبان کے مشہور شاعر الیکزانڈر پشکن کے گھر کو جہاں اس نے شادی کے بعد پہلے پہل قیام کیا تھا۔ ایک قومی عجائب گھر کی صورت میں پیش کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔ جسے عربات میں پشکن کا گھر کا نام دیا جائے گا۔ پشکن کا ایک بہت بڑا مکان اور باغ لینن گراڈ میں ہے۔

روس کے کئی نامور مصوّروں نے اس بازار کی تصویریں بنائی ہیں جس میں مصوّر پولنوو کی شاہکار تصویر "ماسکو کا ایک احاطہ" بہت مشہور ہے۔ یہ احاطہ واقعی دیکھنے میں ایک تصویر کی مانند ہے۔ ابھی ابھی میں والکوف ڈرائیور کے ساتھ اسے خود دیکھ کر آئی ہوں ؎

کہ دیدہ کہ بود مانندِ شنیدہ

منیر اختر کو بھی ساتھ لیا کہ اسے سیر تماشے کا بقول سجاد صاحب ازل سے شوق ہے

بوندا باندی کی جھڑی ہیں اس احاطے میں گھنے گھنے درختوں کے تانبے جیسے پتوں میں چھپے ہوئے قدیم گرجا اور اس کے سنہری کلس دُھلے دُھلے سے عجیب سحر انگیز منظر پیش کر رہے تھے۔ احاطے کے ساتھ کی پگڈنڈی پر دو چار بھولے بھالے بچے سائیکل چلاتے چلاتے ہمیں حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ ماسکو کے عین وسط میں یہ احاطہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی چھوٹے سے گاؤں میں چلے آئے ہوں۔ اس گرجا کے دوسری طرف امریکہ کے سفیر کا دولت کدہ ہے۔ آج بھی اگر آپ برش و رنگ کی پیالی اور کینوس لے کر وہاں چلے جائیں تو عربات کے اندر اس چھوٹے سے احاطے میں گرجا گھر کے قریب کی جگہوں میں کئی مقام ایسے دلکش نظر آئیں گے۔ کہ آپ ان کی تصویر بنا سکیں ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

عربات کے ہی ایک کوچے میں اپنا گلبکینا رہتی تھی۔ جو کہ مجسّمہ سازی کی ایک مشہور فن کار تھی اس کے فن کے نمونے اس کے چھوٹے سے گھر میں آج بھی محفوظ ہیں۔

ان قدیم تاریخی یادگاروں کے علاوہ عربات میں کئی جدید عمارات بھی تعمیر ہو چکی ہیں۔ کئی سینما اور نمائشی ہال یہاں ایک سو کے قریب دکانیں اور کیفے ہیں۔ ان کے علاوہ مشہور۔۔۔ پراگا ریسٹوران بھی یہاں واقع ہے زیبِ داستان کے لئے یہ بھی سن لیجئے کہ پراگا ریسٹوران ماسکو کے بہترین ریسٹورانوں میں سے ہے۔ ہماری ۲۳ مارچ کی سالانہ دعوت یہاں دی جاتی ہے۔ گذشتہ مارچ میں علامہ اقبالؒ کے صد سالہ جشنِ سالگرہ کی تقریب سعید بھی اس کے ایک پر شوکت ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ اس وسیع ہال کے جگمگاتے ہوئے آئینوں پر شیش محل کا گماں ہو سکتا ہے۔ آپ کا جی چاہے تو ان منقش آئینوں میں اپنا چہرہ بار بار دیکھ سکتے ہیں۔ مرزا غالب کے ایک شعر کی صداقت کو ہی آزما سکتے ہیں۔ مرزا غالب نے لاکھ انکساری سے کام لیں کہ ان کے بغیر کون سے کام بنتے یا سدھرتے ہیں ؎

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا!

عربات جدید کے بازار میں "عربات جدید" نامی ایک اچھا ریسٹوران اور بہت نئی نئی جگمگاتی ہوئی دکانیں قطار در قطار ہیں۔ سیاحوں کی فوج کے ساتھ ساتھ خرید و فروخت کرنے والوں کا اژدہام یوں نظر آتا ہے۔ کہ جیسے آپ بندر روڈ یا انار کلی بازار میں ہوں۔

○

مکتوب ماسکو
۲۶

پاکستان اور وسطِ ایشیا کا رشتہ قدیمی اور تاریخی ہے

گذشتہ ماہ سوویٹ وزارت خارجہ کے شعبہ تشریفات کی جانب سے کرغزستان جانے کا دعوت نامہ ملا۔ تاریخ ۱۸ تا ۲۱ ستمبر مقرر ہوئی۔ سجاد صاحب حسبِ معمول اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہ جا سکتے تھے۔ مگر راقم وسط ایشیا کی ازلی گرویدہ ہے۔ جھٹ تیار ہو گئی۔ اور رفاقت کیلئے سعیدہ احمد کو ساتھ چلنے کے لئے آمادہ کر لیا۔

ڈاکٹر سعیدہ احمد ہمارے سفارتخانہ کے کمرشیل قونسلر سعیدہ احمد صاحب کی اہلیہ ہیں پیشے کے لحاظ سے اچھی ڈاکٹر ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دلچسپ ہمسفر بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔

۱۸ ستمبر کی صبح نو بجے ہوائی اڈہ پر پہنچے اور ۱۰ بجے طیارہ اڑا۔ یہ طیارہ بجائے خود ایک عجوبہ روزگار تھا۔ اچھے وقتوں کے بغداد میں ملکہ شہزاد کے زمانے کے طلسمی قالین اڑا کر ادھر سے ادھر لے جایا کرتے تھے۔ یہ اڑن کھٹولا بھی آسودگی کا ایک نادر نمونہ ثابت ہوا۔ جہاز میں داخل ہوتے ہی مسکراتی ہوئی میزبان لڑکیوں سے پھول لے کر جو آگے بڑھے تو یوں معلوم ہوا کہ کسی آراستہ پیراستہ کمرۂ نشست میں آ پہنچے ہوں....

بقول رانی کے دیوار سے دیوار تک طلسمی صوفے دیوان کشن تپائیاں اور میزوں پر پھول، خوبصورت لیمپ، کشادہ کھڑکیاں ایسے ہی سجے سجائے دالان در

دالان، باورچی خانے میں قرینے سے چائے اور کافی کا سامان سجا ہوا بلکہ فضا میں چائے اور قہوہ کی خوشبو لبسی ہوئی۔ سفارت خانوں کی پارٹی میں حُسنِ اتفاق سے چند میری قریبی دوست اور ہمذاق خواتین بھی تھیں۔ مثلاً مسز زین العابدین جو ملیشیا کے سفیر کی اہلیہ ہیں اور جمیکا وینیڈری کے سفیر کی اہلیہ بنگلہ دیش سے ان کے نائب سفیر خورشید بھی ساتھ تھے۔ جو ہر لحاظ سے اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ وزارتِ خارجہ کے رئیس تشریفات مسٹر نکی فراداں کی بیٹی ارینا جو ریحانہ کی دوست ہے وُہ بھی ساتھ تھے یہاں کے اوپڈیکا کے چیف جناب کذنتود بھی تھے۔

ماسکو میں "اوپڈیکا" کا محکمہ بہت اہم ہے۔ "سفارت کاروں" کی دیکھ بھال انھی کی ذمہ داری ہے۔ ان دونوں معزز اصحاب کی وجہ سے سفر کا خوش آئند ثابت ہونا لازمی تھا۔ چند ترجمان وخواتین وحضرات بھی ساتھ تھے جو اپنے غیر زبانوں کی سہولت کے لئے قدم قدم پر روسی زبان کا ترجمہ انگریزی اور فرانسیسی میں کرتے جاتے۔

سفر کے دوران ناشتے اور پھل کے لوازمات کے ساتھ ساتھ دریچے کے باہر کے منظر میرے لیئے دلفریب تھے۔ قریب کے مائیکروفون سے ترجمان کی آواز فرانسیسی اور انگریزی میں آئی۔

"خواتین وحضرات ہم یورال کے سمندر پر سے گذر رہے ہیں۔" ہم آن کی آن میں مشرق میں پہنچ گئے۔ "رود یورال" کا سمندر مشرق اور مغرب کی حد فاصل ہے اور خوبصورت حدِ فاصل ہے۔ میں دریچے سے دور نیچے ان نیلے نیلے پانی کی لہروں میں تاریخ کے اوراقِ گذشتہ ڈھونڈتی رہی....

میں وسطِ ایشیا کی تاریخ کی سادہ ورنگین پُرکاری کا نقشہ دماغ میں بٹھانے میں مصروف تھی کہ جناب نکی فراد صاحب نے بتایا کہ ہم دریائے سر اور دریائے آمو کے قریب سے گذر رہے ہیں۔ فضا میں جھلکتے ہوئے نیچے عمیق وادیوں میں دریائے سر اور دریائے آمو سانپ کی طرح بل کھاتے لہراتے ہوئے بہتے چلے جا رہے تھے۔

ایشیا کی قدیم تاریخ میں اس خطے کو خطۂ ماوراء النہر کہا جاتا تھا۔ یہ ایک بہت زرخیز علاقہ تھا نہ صرف پھلوں اور فصلوں کی پیداوار کے لحاظ سے بلکہ بے شمار اہل قلم اور اہل علم کا بھی مخزن رہا ہے۔

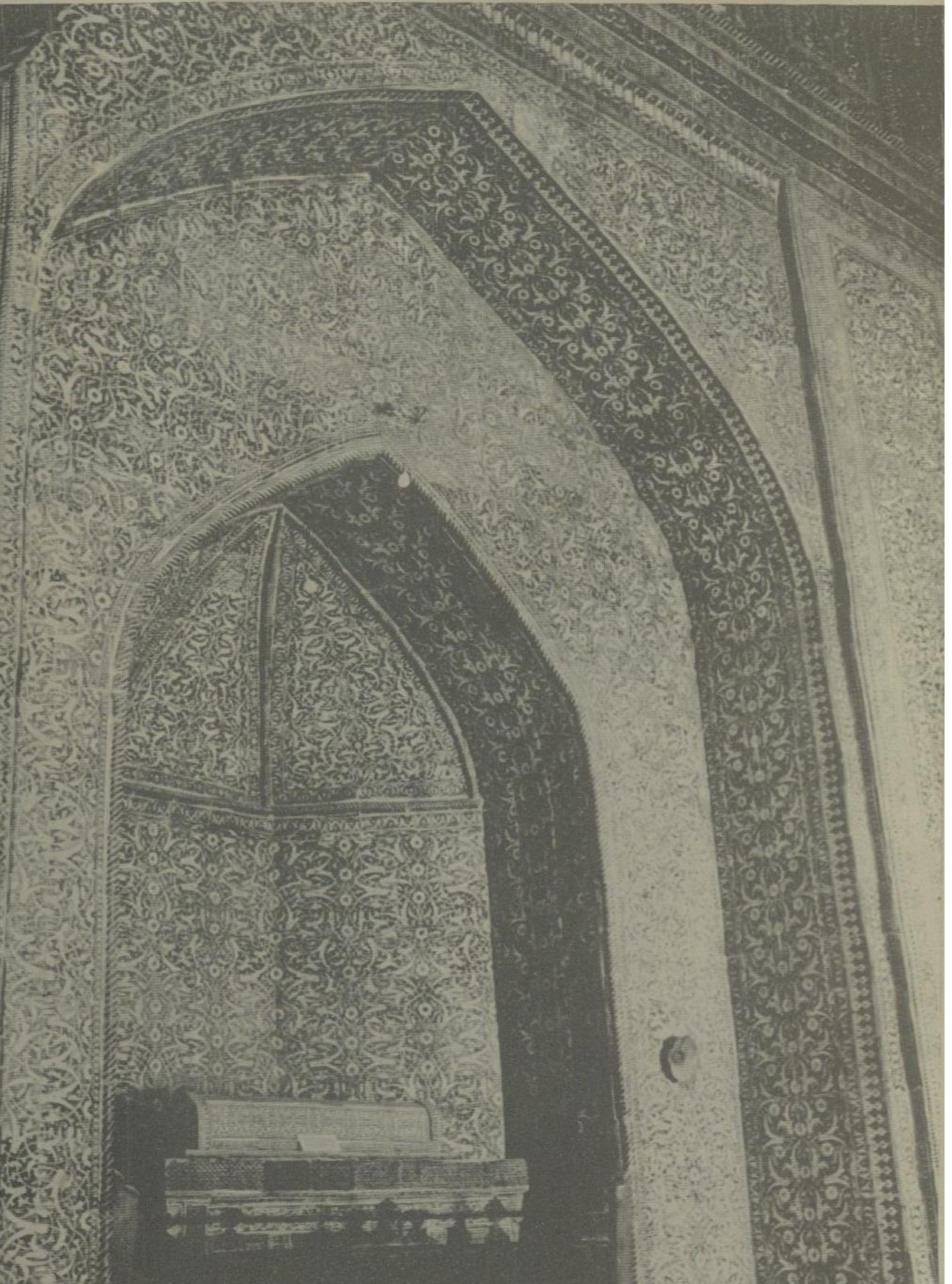
جہاز کی بلندی اور سرعت پرواز نے مجھے دریائے آمو کی لہروں سے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہونے دی۔ یہ تو ہمارا صدیوں کا جانا پہچانا دریا ہے جس کے لئے استاد رودکی نے چند شعر سادہ مگر سچے موتیوں کی طرح آبدار اور موثر کہے تو۔۔۔۔ اُستاد کے ممدوح امیر ابو النصر، ان کے سنتے ہی گھوڑے پر زین کسے بغیر سوار ہو کر عازم بخارا ہو گئے ؎

بوئے جوئے مولیاں آید ہمے

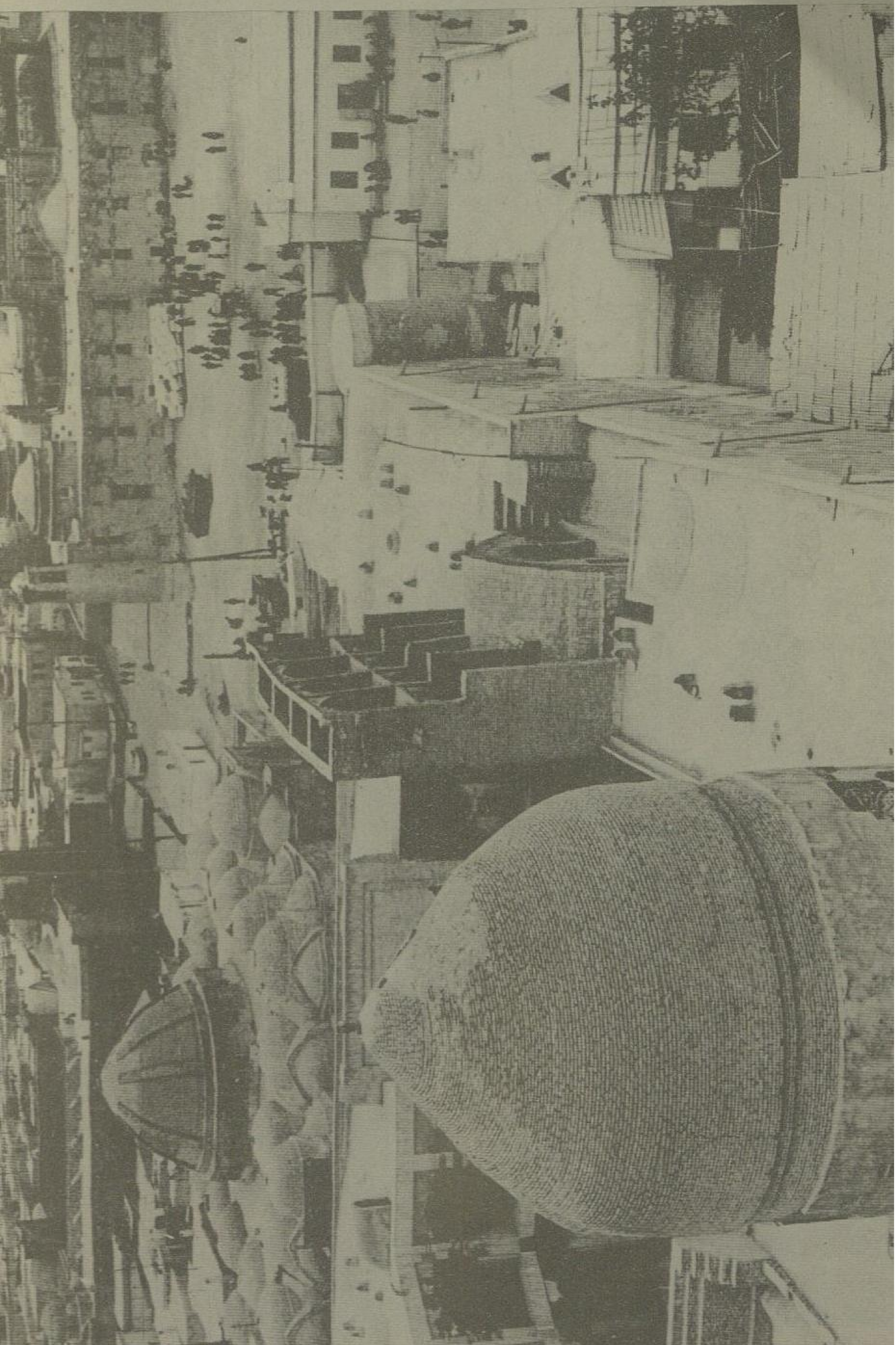
یاد یار مہربان آید ہمے

تصوّر کی دنیا نے مجھے چشم زدن میں صدیوں کا فاصلہ یاد کرا دیا۔

وسط ایشیا کی تاریخی سرزمین الف لیلہ کی حکایتوں کی مانند ہمارے لئے بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ میرے لئے تو یہ ناطہ کہربا کی طرح ہے کہ ایک بات سے سو کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ اس مقدس خطے پر سے اڑتے ہوئے دلِ ناداں نے سوچا کہ عزیز ملک پاکستان میں کیا کیا خزانے ہیں۔ جو ورثہ میں اس نے یہاں سے ہی سمیٹے۔۔۔۔ شہنشاہ بابر، الپ ارسلان، ملک سنجر، جلال الدین خوارزم شاہ یہ سب اسی سنہری زمین کے تانے بانے میں سما جاتے ہیں۔ شہنشاہ بابر سے تو خیر ہمارا بہت قریبی واسطہ ہے۔ لیکن جلال الدین خوارزم شاہ کی دلاوری کو بھی کون پاکستانی نظرانداز کر سکتا ہے۔ اگر اس وقت کے بغداد کی حکومت میں غدار نہ ہوتے تو یہ جیالے بادشاہ منگولوں کو شکست دے دیتے۔ غداری و وطن فروشی ہماری "عجیب و سادہ رنگین داستانِ حرم" میں کوئی اچنبے کی چیز نہیں دور کیوں جائیے۔ میر جعفر اور میر قاسم ہمارے ہم وطن تھے۔ جن کی فرنگی نوازی نے سلطان ٹیپو اور سراج الدولہ جیسے دلیروں کی فراست کو ناکام کر کے اپنے دیس پر پردیسی حاکم لا بٹھائے اس



خیوہ (ازبکستان) میں ایک قدیم مقبرہ



غیور شہزادہ نے حملہ آوروں کی اطاعت قبول کرنے کے بجائے پہاڑ کی بلندی سے اپنے گھوڑے سمیت دریائے سندھ کی عمیق پانیوں میں چھلانگ لگانی بہتر سمجھی۔ اسی واقعہ کا ذکر سجاد صاحب نے خوارزم کے قدیم دار لخلافہ کے رئیس شہر سے کرتے ہوئے کہا تھا کہ " محترم! ہمارا اور آپ کا تاریخی رشتہ بہت قدیم ہے اور بہت عزیز ہے"......

مغل اعظم جب ہمارے ملک میں یعنی جنوب ایشیائی براعظم میں آئے تو اپنے ہمراہ ایک نیا اسلوبِ زندگی بھی لیتے آئے۔ مذہب اسلام کے وہ ہلاکو خان کے پوتے کے زمانے سے معترف ہو چکے تھے۔ یہ کوئی معمولی مذہب نہ تھا بلکہ ایک مکمل معاشی نظام اور اخلاقی ضابطہ تھا تو پھر کیا تعجب ہے کہ حملہ آوروں کی فوج ظفر موج کے ساتھ اہل قلم، شاعر، مصنف، مؤرخ، حکیم و فلسفی، معمار موسیقی کار اور فن کار بھی بے شمار آئے جن کی وسعتِ فکر نے اس سرزمین کو ایک نئے روپ میں ڈھالا اور اس بے پناہ دریائے حکمتِ وفضیلت نے موجزن ہو کر نت نئے طریقوں سے اس نئی دھرتی کو سیراب و شاداب کیا۔ مغل شہنشاہوں نے اپنے سب قلعے دار ی گنگ وجمن میں بنوائے جیسے کہ وہ اپنے آمو اور سیر دریاؤں کی یاد میں بے تاب ہو رہے ہوں۔ بابر کو جب فرغانہ اور سمر قند کے شاداب گلابوں کی یاد نے ستایا تو اس نے جا بجا اپنے نئے تعمیر شدہ باغات میں وہی گل وبلبل کی داستان دہرا دی۔

ہم بھی پھولوں کو گل کہتے ہیں اور ہمارے گلابوں کی مہک بھی ویسی ہی دل آویز مسحور کن ہے۔ جیسے کہ سمرقند، بخارا، عشق آباد اور رفرنزے ہیں۔ شفتالو، زردالو آلوچا، انجیر، انار، پستہ، بادام، کشمش، زعفران یہ سب میوے ہمارے اور مملکت کرغزستان میں مشترک ہیں اور ہم نام بھی ہیں۔ ہمارے خربوزے اور تربوز بھی "تربز" ہیں۔ کرغزی زبان جو کہ (ترکی تاتاری بنہ ہے) میں عربی فارسی کی بہت آمیزش ہے۔ یہاں تک کہ تازہ میوے کو وہ بھی تازہ میوہ کہتے ہیں۔

جہاز سے اترتے ہی وہاں کی خاتون وزیر خارجہ محترمات خانم صاحبہ نے بہت تپاک سے خیر مقدم کیا۔ ان کے ساتھ چند بھولی بھالی کرغیز بچیاں اپنے قومی لباس میں ہاتھوں میں گلدستے تھامے کھڑی تھیں۔ ان کو پیار کر کے پھول لیتے وقت وہی اردو اور کرغیزی زبان کے مقدس رشتے نے رہبری کی اور میں نے انہیں بہت یگانگت سے رحمت وسلامت کہا (شکریہ جیتی رہو) رئیس مملکت کرغزستان کی طرف سے ۲۰ اکتوبر کو ایک شاندار عشائیہ تھا کھانے کے دوران معزز میزبانوں سے اپنی اسی مشترک دولت یعنی مذہب اور تمدن کے طفیل بے زبانی کا پردہ رہ گیا۔ میز پر بیٹھے ہوئے سبھی میزبانوں نے پاکستان کے لئے دلی محبت کا اظہار بہت خلوص سے کیا۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی سب وسط ایشیا کی ری پبلکوں کے مسلم ہونے کا اقرار بھی بہت انبساط سے کیا۔ باتوں باتوں میں میرے دائیں طرف بیٹھے ہوئے پارٹی کے ایک معزز رکن نے بتایا کہ ان کی دو بیٹیوں کے نام گل نور اور آیا نور ہیں۔ تاتاری میں آیا کے معنی چاند کے ہیں۔ ہماری اچھی سی کرغیزیہ ترجمان لڑکی کا نام بھی آیا گل تھا۔ جو انگریزی زبان میں مہارت رکھتی تھی۔

دوسری صبح قومی عجائب گھر دیکھنے کو جاتے ہوئے بس میں خورشید حسن اتفاق سے اسی لڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے بلٹ کرار دو میں کہا اس سفر میں ہمارے لئے چاند سورج کا ساتھ اچھا رہا۔

قومی عجائب گھر میں دیگر قدیم نوادر کے ساتھ ساتھ خوبصورت دستکاری کے نمونے بھی دیکھے بالکل سندھی رلّی کے کام کی دستکاری اور ملتان کے آر کے کام کے رنگا رنگ ملبوسات لگ رہے تھے۔ پردے، قالین، نمدے، میز پوش، گاؤ تکیے، جھالر لگے سینی پوشی اور چمڑے کے زین پوش اور کشیدہ کی ہوئی پانی کی چھاگلیں چمڑے کی تھیں یہ سب کچھ دیکھ کر میری عزیز دوست سعیدہ کچھ پشیمان ہو کر بولیں۔ کیا یہ دستکاری بھی ہم نے انہی سے لی ہے؟ میں تو سمجھی تھی کہ رلی کا کام خاص سندھی چیز ہے۔ کیونکہ آر کا کام ہمارے ملتان کا ہے (سعید صاحب خیر سے ہیں بھی ملتان کے) میں

نے کہا "کیا مضائقہ ہے ایک نعت کے میٹھے سے بول یاد نہیں آپ کو؟"

جب باغ جہاں کے مالی نے کی دیکھا بھالی پھولوں کی!

اک پھول ؐ کو اس نے چھانٹ لیا تھی جتنی ڈالی پھولوں کی

اُسی پھول کا نام محمدؐ تھا......

اس گل رعنا نے دنیا میں چپے چپے پر پھولوں کی داغ بیل ڈالی کانٹوں کو سمیٹا۔

یہ پھول تو صرف دھاگے اور ریشم سے بنے ہوئے ہیں۔ اس پاکیزہ اور مطہر نام سے تو افسردہ دلوں کی کلیاں چٹک جاتی ہیں اور پل بھر میں ملکوں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔

فرنزے کا قدیم نام پشپک ہے اور یہ سرحد کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ انقلاب روس کے بعد یہ شہر از سر نو تعمیر ہوا ہے۔ اب یہ جدید عمارت وسیع باغات چوڑی چوڑی سڑکیں لئے روشنیوں سے جگمگاتا ہوا ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہاں چپے چپے پر مدرسے ہیں ہم ۹ اِکی صبح گیارہ بجے لڑکیوں کا موسیقی کا ایک اسکول دیکھنے گئے۔ جہاں دور دیہات سے چھ سے چودہ سال تک کی عمر کی لڑکیاں آکر باقاعدہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ موسیقی بھی سیکھتی ہیں۔ مثلاً پیانو، وائلن، گیٹار، رباب اور گن اور ساز وغیرہ وغیرہ۔

مکتب کے ساتھ ہی طالبات کے رہنے کی عمارت تھی جواں کی مہربان میٹرن نے دکھائی، اُجلے اُجلے بچھونے بچھے تھے۔ طالبات کے کمرے ایسے صاف اور شفاف تھے کہ بقول کسے، مثلِ آئینہ ننھی ننھی بچیاں اپنی گلابی اور سفید یونیفارم پہنے بالوں کو سلیقے سے گوندھ کر گلابی اور سفید رنگوں کے ربن سجائے پھول دیتی ہوئی خود بھی گلاب کے پھول کی، ان کھلی کلیاں لگ رہی تھیں۔ ان سے ایک دلچسپ کونسرٹ بھی سنا اس مکتب کی رہائش اور خوراک تعلیم بالکل مفت ہے۔ بلکہ چھٹیوں میں تفریح کے مقام پر آنے جانے اور رہنے کا انتظام بھی حکومت کی طرف سے ہے۔ یوں تو سبھی لوگ کہتے ہیں کہ بچے ہر ملک کا اصل خزانہ ہیں اور نام خدا یہ مستقبل کے رکھوالے ہیں مگر اس خیال پر صدق دل سے عمل سوویت یونین میں ہی دیکھا۔ یہاں صرف ماسکو جیسے بڑے شہر کی سند نہیں بلکہ سوویت یونین کے ۱۵ ری پبلکوں کے ہر شہر گاؤں

میں چھوٹے بڑے بچوں کے لئے عمدہ ترین علمی ادارے قائم ہیں۔ تعلیم بالغان کی اسکیم کے تحت یہاں صد فی صدی لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ یوں تو ہمارے رسول اکرمؐ کا فرمان ہے کہ علم و فضل کو جہاں بھی پاؤ مومن کی گم گشتہ میراث سمجھ کر سمیٹ لو۔

شام کی دعوت میں آرکسٹرا بجانے والے لڑکے اور لڑکیوں نے قومی لباس پہن رکھا تھا۔ لڑکیوں کے باریک جھالر لگے سفید ڈھاکے کی ململ جیسے ملائم لمبے لمبے کرتے پشوازنما اور ان کے ساتھ ریشم کی کلابتوں کے کام کی صدریاں کسی کی سبز کسی سُرخ تو کسی کی نیلگوں تھی

اودے اودے پیلے نیلے پیرہن

سر پر قرمزی مخمل اور سنجاب کی گوٹ لگی گول ٹوپی اور ٹوپی پر ایک سفید پَر جیسے کہ بال ہما ان کے سیاہ چمکیلے بال اور چمپئی رنگت ملاحت لئے مشرق کی صبح آئینہ دار۔ لڑکوں نے مخمل کی خاصی لمبی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ سیاہ اور سفید کام کی اونچی سی ٹوپی جب انہوں نے ساز و رباب چھیڑا تو ہر نغمہ دل میں اترتا معلوم ہوا سے

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

---

۲۰ کی صبح ایک چار منزلہ وسیع عمارت میں سلائی کا کارخانہ دیکھا۔ یہاں بچوں اور بڑوں کے ہر سائز کے لباس تیار ہو رہے تھے۔ مشین سے کپڑے پیمائش ہو کر قطع ہوئے اور مختلف ڈیزائن کے سلتے جاتے۔ صرف عورتیں اور لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ ہمارے سامنے منٹوں میں ایک قطار میں ساتھ ساتھ اسکول کی بچیوں کی یونیفارم کٹے بھی اور سلے بھی بٹن بھی ٹانکے گئے استری بھی ہو گئی اور قیمت کے لیبل بھی لگ گئے۔ یہاں ایک بھولی بھالی سی لڑکی سے نام پوچھا تو اس نے شرما کر کہا بدر منیر، دوسرے ہال میں ایک پیاری سی لڑکی نے اپنا نام عائدہ بتایا۔ یہ بچیاں مخملیں ٹوپیوں پر بہت نفاست سے کڑھائی کر رہی تھیں۔

۲۰ کو ہی غالباً ہم الارچا گورج دیکھنے گئے یہ جگہ آلتائی پہاڑوں کے درمیان کی

وادی سے گذر کر ساڑھے تین ہزار فٹ کی بلند مچار ہے راستے میں سڑک کے ساتھ ساتھ کئی میل تک یہ دریا پہاڑوں سے نکل کر بہتا ہوا ہم رکاب رہا۔ ان سرمئی پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف چاندی کی طرح دمکتی نظر آرہی تھی۔ ان کے دامن میں اس دریا کا پانی کسی کسی جگہ موتی جیسا آبدار سنگریزوں پر پھیلتا سمٹتا اور اٹھکھیلیاں کرتا سورج کی چمکیلی کرنوں سے مل کر ایسا رنگین نظر آیا کہ جیسے دور بہتے ہوئے۔ بچپن میں ہم شب برات میں مہتابیاں جلا کر پانی میں سمویا کرتے۔ سامنے حدِ نظر تک آلتائی پہاڑ تھے کرغیزی ان کو آلتا و کہتے ہیں۔ مجھے مدت سے شہر کاشغر کی تلاش تھی وہی اپنا اقبال والا کاشغر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے\
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

کبھی یہ شہر پورے ترکستان کا حصہ تھا۔ پھر غالباً روسی ترکستان میں رہا اب چین کی حد میں شامل ہے۔ ماسکو میں ایک بار میں نے جناب سابق سفیر چین کے سیکرٹری سے بھی اس کا اتا پتا دریافت کیا مگر وہ بھی ٹھیک حدود اربعہ نہ بتا سکے۔ اب وہی سوال حاتم طائی کے قصے کی طرح خاکسار نے یہاں کے جناب وزیر زراعت سے کیا تو نہ پوچھئے کہ ان کے جواب سے مجھے اچانک کس قدر خوشی حاصل ہوئی کہ اپنا پرانا کاشغر اس وقت بالکل ہمارے مقابل آلتائی پہاڑوں کے دوسری طرف ہے۔ وہی عرفی کی مشہور غزل کا مضمون ٹھہرا۔

در دیدہ ام نہاں و در دل نشستۂ\
خلقے دریں گماں کہ مقابل نشستۂ

جب منزل پر پہنچے تو وہاں ہمارے لئے رنگ برنگ کے خیموں میں پُر تکلف دعوت کا انتظام تھا۔ یہ خیمے منگول کی ایجاد ہیں۔ اب بھی منگولیا کے شہر اولان باطور میں پچاس فیصدی آبادی انہی خیموں میں رہتی ہے۔ یہ خیمے باہر سے ریشم اور اون سے بنے ہوئے جیسے کے بلوچی نمدے ہوں نقش و نگار کئے ہوئے ہوں۔ اندر سے دیوار گیریاں بھی تمام کی تمام اون اور ریشم سے کڑھی ہوئی ہیں۔ ایسی خوب صورت گل کاری جیسے کشمیر کی قدیم

جامہ دار ہو یا راولپنڈی کی پھل کاریاں ۔

کھانے سے پہلے عین اسلامی طرز پر لڑکیاں آفتابہ اور چلمچی ہاتھ دھلانے کے لئے لے آئیں ۔ طعام میں سب سے اول پیالے میں شوربا اور ساتھ میں گرم و نرم نان، پھر پلاؤ، کوفتے سیخ کباب، بینگن کا رائیتہ ٹماٹر اور کھیرے کا سلاد گویا وہی اپنے مغلئی کھانے میز کے وسط میں سینی میں انگوروں کے ڈھیر اور تربوز و گرما و انار جن کے کھانے کے لئے الگ اصرار با محبت تھا ۔ یہاں چائے کا سماوار ہر وقت سرگرم رہتا ہے ۔ چائے کو یہاں بھی چائے اور سبز کو سبز ہی کہتے ہیں ۔ سو سبز چائے فنجان میں پی کر ایسا سکون ملا گویا کہ ہم اپنے کوئٹہ اور پشاور میں بیٹھے ہوں ۔

---

۲۱ کی دوپہر کو واپسی تھی اسی صبح پھل کی منڈی گئے جسے روسی زبان میں رینک کہتے ہیں ۔ یہاں بازار میں انگور سردے انار سبھی پھل ڈھیروں نظر آئے ماسکو سے قیمت بھی بہت ارزاں ایک پھل والے نے مجھے بلا کر گرما کی ایک بڑی سی کاش پیش کرتے ہوئے تاتاری میں کہا کہ "خانم اس خاص گرما کا نام ہم نے پاکستان رکھا ہے"۔ وہ یوں کہ یہ بہت شیریں ہے ۔ از راہ کرم آپ کھا کر تو دیکھئے"۔ کچھ تو ان کی تاتاری مجھے سمجھ میں آگئی اور کچھ ہمارے معزز ترجمان نورالدین غازی صاحب سے تفصیل سن کر اس قدر فخر محسوس ہوا کہ جی چاہا کہ اس سرزمین کے پرانے آقاؤں کی طرح اس پھل والے مہربان کا منہ موتیوں سے بھر دوں یا اس کی دوکان کے یہ تمام خربوزے اور تربوز سونے میں تول کر لٹا دوں مگر بس آنکھیں جذبہ تشکر سے پر نم ہی ہو کر رہ گئیں اور میں بمشکل یہ کہہ سکی کہ صد رحمت و سلامت ۔

بہت سا پھل خرید کر ہم میوہ منڈی سے گھوڑ دوڑ کے میدان گئے ۔ کرغز مرد و زن غضب کے شہسوار ہیں وہاں نو عمر لڑکے اور لڑکیوں نے سرپٹ گھوڑے دوڑا کر بہت سے کرتب دکھلائے مجھے لاہور کا ہارس شو یاد آتا رہا ۔ گھوڑوں کا موسیقی کے ساتھ رقص بھی ہوا اور شاہین باز بھی دیکھے چائے کے وقفے میں مسز سعید احمد میں اور مسز زین العابدین

اوپر کی گیلری میں گئے۔ (جہاں سے مہمانوں کے لئے مخصوص سرخ مخمل و بانات کا فرش تھا) قہوہ میں قند و شکر ملا کر نوشِ جان کرتے ہوئے محترمات خانم صاحبہ سے چند دلچسپ باتیں ہوئیں۔ جب انہوں نے ایک طشتری میری طرف بڑھائی تو اس مانوس سی چیز کو چکھنے سے پہلے میں نے ان سے نام پوچھا اب سعیدہ کی حیرانی کا ذرا دوبارہ اندازہ لگایئے کہ جب ہماری معزز میزبان نے مسکرا کر آنکھوں میں چمک لاتے ہوئے کہا" باقرخانی"

ظہرانہ کے لئے ایک بجے شاندار ہوٹل کرغزستان پہنچے یہ دعوت رئیس بلدیہ کی طرف سے تھی بہت اہتمام کے ساتھ پس منظر میں کرغزستان کی قومی موسیقی مدّھم سروں میں بج رہی تھی۔ دعوت کے بعد دلچسپ تقریروں اور جواب در جواب شکریے میں ساڑھے تین بج گئے ساڑھے چار بجے طیارے کا وقتِ روانگی تھا۔ جلدی جلدی ہوٹل پہنچ کر اپنا سامان لیا اور پھولوں پھلوں سے لدے پھندے ہوائی اڈے آ پہنچے۔

محترمات خانم صاحبہ وزیرِ خارجہ مملکت کرغزستان کو خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے کہا کہ "آپ کی اس کمالِ مہمان نوازی نے ہمارے ساتھی دیارِ مغرب کے سفیروں کو تو ضرور حیران کر دیا ہے۔ مگر میرے لئے مشرق خصوصاً اس خطۂ زمین کی خوئے دل نوازی کوئی اجنبی چیز نہیں اس بے پایاں محبت کے لئے پاکستان کی طرف سے آپ کا شکریہ اور پاکستان کا سلامِ الفت پیش کرتی ہوں۔"

تین چار دن کے مختصر قیام کرغزستان کے بہت سارے خوشگوار تاثرات کو دل میں سمیٹے شام ساڑھے آٹھ بجے (ماسکو کے وقت کے لحاظ سے) بخیر گھر پہنچ گئے۔ مگر یوں معلوم ہوا کہ جیسے گھر وہاں کبھی ہو سہ نہ بہ جادۂ قرارش نہ بہ منزلے مقامش

دلِ من مسافرِ من کہ خداش یار بادا

اقبالؔ

○

[م جھ رل]

